ادارہ تحقیق و تصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

# تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ



پان والی کوٹھی، دُودھ پور، علی گڑھ
۲۰۲۰۰۱

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا سہ ماہی ترجمان

# تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

اپریل ——— جون ۲۰۰۲ء

—: ایڈیٹر :—

سید جلال الدین عمری

پان والی کوٹھی دودھ پور

پوسٹ بکس ۹۳ ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

# سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ

جلد ۱۸ شمارہ ۲

اپریل ـــــــــ جون ۲۰۰۲ء

محرم الحرام ـــــــــ ربیع الاوّل ۱۴۲۳ھ


## زر تعاون

اندرون ملک ـــــــــ فی شمارہ ۲۵ روپے

ـــــــــ سالانہ ۹۰ روپے

ـــــــــ لائبریری وادارے سالانہ ۱۲۵ روپے

بیرون ملک ـــــــــ (انفرادی) " ۴۰۰ روپے

ـــــــــ (ادارے) " ۶۰۰ روپے

پاکستان ـــــــــ (انفرادی) " ۲۰۰ روپے

ـــــــــ (ادارے) " ۳۰۰ روپے


طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے دعوت آفسٹ پرنٹرس دہلی ۔۶ سے چھپوا کر ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، پان والی کوٹھی دودھ پور علی گڑھ سے شائع کیا

# فہرست مضامین

## حرفِ آغاز


غیر اسلامی ریاست میں مسلمان کا کردار — سید جلال الدین عمری — ۵


## تحقیق وتنقید


شاہ ولی اللہ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیروں کا تقابلی مطالعہ — ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی — ۳۹

حلف الفضول۔ عصری معنویت — ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی — ۶۱


## بحث ونظر


دلائلِ ربوبیت اور خلافت ارض — مولانا محمد شہاب الدین ندوی مرحوم — ۸۳


## سیر وسوانح


علامہ ابوحیان اندلسی۔ حیات وخدمات — ڈاکٹر محمد بلال حسین — ۱۰۷

مترجم: مولانا محمد جرجیس کریمی


## تعارف وتبصرہ


مقالات "مولانا عبدالسلام ندوی سمینار" — ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۲۰

# اس شمارے کے قلمی معاونین

۱۔ ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی
ناظم دینیات (سنی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
رفیق ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

۳۔ مولانا محمد شہاب الدین ندوی (مرحوم)
بانی وناظم فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ بنگلور

۴۔ ڈاکٹر محمد بلال حسین
ریڈر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، راج شاہی یونیورسٹی بنگلہ دیش

۵۔ مولانا محمد جرجیس کریمی
رفیق ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

۶۔ سید جلال الدین عمری
صدر ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

— : خوش نویس : —
ابریسیف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

## حرفِ آغاز

# غیر اسلامی ریاست میں مسلمان کا کردار

سیّد جلال الدین عمری

کسی نظریہ پر سنجیدہ بحث اور گفتگو غلط نہیں ہے، بلکہ یہ مختلف پہلوؤں سے مفید ثابت ہوتی ہے۔ لیکن بے جا جرح و تنقید اور جارحانہ حملوں کو صحیح نہیں قرار دیا جاسکتا۔ یہ ایک ناجائز اور نامعقول رویّہ ہے۔ اس سے مسئلہ کو سمجھنے میں مدد نہیں ملتی بلکہ الجھنیں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ موافق اور مخالف افراد کے درمیان ذہنی دوری پیدا ہوتی اور اس میں وقت کے ساتھ اضافہ ہونے لگتا ہے۔ اس کا اثر پوری زندگی پر پڑتا ہے۔ افسوس کہ اسلام کے بارے میں اس کے مخالفین نے بالعموم بحث و مباحثہ کا یہی غلط طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔ اس کی تعلیمات کی من مانی تشریح کی جاتی ہے، اس پر وہ اعتراضات کیے جاتے ہیں جو اس پر وارد نہیں ہوتے، اس کے بارے میں دیدہ و دانستہ غلط فہمیاں پیدا کی اور پھیلائی جاتی ہیں۔ اسے صحیح شکل میں دیکھنے کی کوشش نہیں ہوتی۔ یہ کوئی نئی اور انوکھی صورتحال نہیں ہے، اس کی ایک لمبی تاریخ ہے۔ آج یہ تاریخ مختلف اسباب کے تحت زیادہ زور اور قوت کے ساتھ دہرائی جارہی ہے۔ اسلام کا اس طرح ذکر ہوتا ہے جیسے وہ وحشت و بربریت کا دین ہے۔ اس کے افکار و تصورات غیر عقلی، غیر فطری، ناقابلِ عمل اور موجودہ دور کے لیے ناقابلِ قبول ہیں۔ اس کی اخلاقیات اور اس کے قوانین، عدل و انصاف کے تقاضے پورے نہیں کرتے، وہ انسانوں کو ماننے والوں اور نہ ماننے والوں میں تقسیم کرتا اور دونوں کے الگ الگ حقوق متعین کرتا ہے۔ اس کے نظام میں مساوات اور برابری نہیں ہے۔ دورِ حاضر کی اس بھیانک فضا اور برگشتہ ماحول میں ان افراد اور جماعتوں کو جو اسلام پر اپنے ایمان و یقین کا اظہار کرتی اور اسلام کو دنیا کے لیے باعثِ رحمت اور بہترین نظامِ حیات سمجھتی ہیں، فکری بے راہ روی کا شکار قرار دینا

تعجب خیز نہیں ہے۔ وہ اپنے ایمان اور عقیدہ کے تحت اسلام کی سربلندی کی خواہاں ہیں اور اس کے لیے آئین وقانون کی حدود میں جدّوجہد کر رہی ہیں تو بھی انھیں وحشت و بربریت کا علم بردار تصور کیا جاتا ہے۔ یہ کسی واقعہ یا حادثہ کے نتیجہ میں رونما ہونے والا ہنگامی ردّعمل نہیں ہے بلکہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ اس وقت مسئلہ کسی خاص گروہ کا نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر پوری امت مسلمہ کا ہے۔ اس کے چاروں طرف بدگمانیوں اور غلط فہمیوں نے گھیرا ڈال رکھا ہے۔ اس کی تصویر اس طرح پیش کی جارہی ہے جیسے اس سے کسی خیر اور بھلائی یا اعلیٰ اخلاقیات کی توقع نہیں کی جاسکتی، اس کا پورا کردار ہی مشکوک ہے اور سماج کے لیے اس کی افادیت کسی دور میں تھی بھی تو اب باقی نہیں رہ گئی ہے۔

اسلام ان خیالات کی از اول تا آخر تردید کرتا ہے۔ اس کا ان سے دُور و نزدیک کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام نام ہے اللہ واحد کی عبادت و اطاعت کا، تقویٰ اور انابت کا، امن و امان کا، خیر و بھلائی کی راہ میں پیش قدمی کا، اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ کردار اپنے اور دوسروں کے اندر پیدا کرنے کا، انسان کو انسان سمجھنے، اس کے ساتھ خیرخواہی کا تعلق رکھنے، ظلم کو ختم کرنے اور عدل و انصاف کو قائم کرنے، انسانوں کے درمیان سے جھوٹے امتیازات کو مٹانے، ان کے ساتھ مساوات برتنے اور ان کے حقوق کی حفاظت کا۔ اس کی اصل تعلیمات کی طرف رجوع کرکے ہر شخص اسلام کی اس تصویر کو کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ ہزار کوششوں اور تدبیروں کے باوجود اس پر پردہ ڈالنا آسان نہیں ہے۔

## غیر اسلامی ملک اور مسلمان

اسلام کا مطالعہ مختلف زاویوں سے ہوسکتا ہے۔

یہاں ایک خاص رخ سے اس کا مطالعہ پیش نظر ہے۔ وہ یہ کہ اسلام کے متعلق یہ تصوّر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ غیر اسلامی ریاست اور غیر اسلامی معاشرہ کے خلاف نفرت اور عداوت کے شدید جذبات ابھارتا ہے، اسے کسی قیمت پر تسلیم نہیں کرتا اور اپنے ماننے والوں کو اس سے محاذ آرائی اور بغاوت کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ اس لیے اسلام کے ماننے والے غیر اسلامی ملک کے وفادار

شہری نہیں ہوسکتے۔ ان پر اعتماد کرنا اس کے لیے مشکل ہوگا، وہ دشمن سے ساز باز کرسکتے ہیں۔ ملک سے ان کی خیر خواہی مشتبہ رہے گی، غیر مسلم آبادی سے ان کے تعلقات صحیح نہیں ہوسکتے، ان سے بہتر سلوک کی توقع نہیں کی جاسکتی اور غیر مسلموں کی جان، مال اور عزت و آبرو کو ان سے خطرہ رہے گا۔ ان الزامات کا پوری دنیا میں مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک کہیں سے کوئی ثبوت تو نہیں ملا ہے، اس کے باوجود یہ ایک خاص ذہن ہے جو کبھی دبے لفظوں میں اور کبھی کھلے بندوں سامنے آتا رہتا ہے۔ بعض لوگوں کو اس کے اظہار میں تامل ہوتا ہے لیکن بہرحال وہ بھی مسلمانوں کو خطرناک ضرور محسوس کرتے ہیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ جو مسلمان کسی غیر اسلامی ملک یا غیر مسلم معاشرہ میں رہتے بستے ہیں، انھیں اسلام نے کیا ہدایات دی ہیں، ان کے لیے اس کے کیا احکام ہیں اور انھیں کن باتوں کی تعلیم و تربیت دی گئی ہے؟ اسی سے یہ فیصلہ کیا جاسکے گا کہ جو فرد یا گروہ اسلامی تعلیمات کا پابند ہے، اس کا کسی غیر مسلم ملک میں کیا کردار ہوگا، وہ ملک کا بہی خواہ ہوگا یا بدخواہ، ملکی فضا کو مکدر اور ماحول کو خراب کرے گا یا اسے بہتر بنانے کی کوشش کرے گا، اس کی قوتیں اور صلاحیتیں تعمیر میں لگیں گی یا تخریب کا ذریعہ ثابت ہوں گی، دیگر مذاہب کے ماننے والوں سے اس کے تعلقات کا کیا حال ہوگا اور اس سے کس اخلاق و کردار کی توقع کی جائے گی؟

## اسلامی ہدایات

غیر اسلامی ریاست یا غیر مسلم معاشرہ میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے اسلام نے خاص ہدایت یہ دی ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے عقیدہ اور فکر پر مضبوطی سے قائم رہیں، اس کے مطابق ممکنہ حد تک زندگی گزاریں۔ عقیدہ کو کسی بھی وقت اور کسی بھی حال میں چھوڑا جاسکتا ہے اور نہ اس میں کوئی ترمیم و تنسیخ کی جاسکتی ہے۔ اسلام کی یہ ہدایت موجودہ دور کے تسلیم شدہ اس اصول کے عین مطابق ہے کہ ہر شخص کو اپنے عقیدہ پر قائم رہنے اور اس پر عمل کرنے کا قانونی حق حاصل ہے۔ اسلام اس حق کو استعمال کرے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ یہ کسی کی عداوت اور دشمنی پر

مبنی نہیں ہے، اس لیے اس سے ہراساں ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

اسلامی تعلیمات سے یہ بھی واضح ہے کہ غیر اسلامی ریاست کا مسلمان شہری، ریاست کا اور اپنے وطن کا بہی خواہ اور مخلص ہوتا ہے۔ غداری اور بے وفائی اس کے عقیدے اور دین کے خلاف ہے۔ اس کی ذمہ داری ہے کہ جس ملک میں ہے اسلامی فکر کے تحت اس کی تعمیر و ترقی کی کوشش کرے، اسے صحیح فکر، اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ سیاست سے روشناس کرائے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ نظام حیات کو دلائل کے ساتھ پیش کرے اور اس پر غور و فکر کی دعوت دے اور خدا ترسی اور نیکی کا ماحول پیدا کرے۔ اس کے ساتھ وہ اعلیٰ کردار کا حامل ہو۔ انسان کو انسان کی حیثیت سے دیکھے، اس کے حقوق پہچانے، مخالف فکر و عقیدہ کے حاملین سے بھی بہتر تعلقات رکھے اور ان کے ساتھ تہذیب، شرافت اور اخلاق کا رویہ اختیار کرے۔

ایک مسلمان ان تعلیمات کا پابند ہے۔ اس کے اندازِ فکر سے تو اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن قانونی اور اخلاقی لحاظ سے معاشرہ میں اسے اپنا کردار ادا کرنے سے باز رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو جو ہدایات دی ہیں وہ بالکل عام ہیں۔ ان کا تعلق مکّی دور سے بھی ہے جس میں مسلمان ایک غیر اسلامی معاشرہ میں زندگی گزار رہے تھے اور مدنی دور سے بھی ہے جہاں خالص اسلامی معاشرہ قائم تھا، اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان ہدایات کا پابند صرف اسلامی معاشرہ ہے یا غیر اسلامی معاشرہ ہی سے ان کا تعلق ہے۔ ان کی اہمیت دونوں طرح کے معاشروں کے لیے ہے۔

جو مسلمان، غیر اسلامی ریاست کے شہری ہیں، انھیں اپنے دین و ایمان کے سلسلہ میں اسلام نے جو ہدایات دی ہیں، پہلے ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

## دین پر استقامت

کسی بھی غیر اسلامی ریاست میں ایک مسلمان کے لیے دینی لحاظ سے کم یا زیادہ، چھوٹے یا بڑے مختلف نوعیت کے مسائل ہو سکتے ہیں۔ اس کا بھی امکان ہے

کہ حالات نسبتاً موافق ہوں اور حالات کے ناسازگار ہونے کا بھی امکان ہے۔ اس کا تعلق غیر اسلامی ریاست کے قانون، حکمرانوں کے رویّہ اور عوام کے مزاج سے ہے۔ اس میں اس بات کا بھی دخل ہے کہ خود اسلام کے ماننے والے اپنا دینی، اخلاقی اور سیاسی وزن کتنا رکھتے ہیں اور ان میں اپنے مسائل حل کرنے کی کتنی طاقت ہے؟

قرآن مجید نے اہلِ ایمان کو ہر طرح کے حالات میں عزم و ہمت اور حوصلے کے ساتھ دین پر قائم رہنے اور اس کے مطابق عمل درآمد کی تعلیم دی ہے۔ اس کی ہدایت ہے کہ حالات کتنے ہی سخت کیوں نہ ہوں اور ماحول کتنا ہی ناخوش گوار کیوں نہ ہو، مردِ مومن کو دین پر استقامت اور پامردی کا ثبوت دینا چاہیے۔ حالات کی شدّت اور نزاکت سے گھبرا کر دین و ایمان سے دست کش ہو جانا یا اس میں کسی قسم کی مداہنت اختیار کرنا کسی صاحبِ ایمان کے لیے روا نہیں ہے۔ اس کے لیے حسبِ استطاعت بڑی سے بڑی قربانی سے بھی اسے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ مکہ کے نازک ترین حالات اور سخت آزمائش کے دور میں بار بار دین پر استقامت کی ہدایت کی گئی اور اس پر آخرت کی کامیابی اور جنت کی بشارت سنائی گئی۔ ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا | بے شک وہ لوگ جنھوں نے کہا کہ ہمارا |
| اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ | رب اللہ ہے اور پھر استقامت دکھائی ان |
| عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا | پر (موت کے وقت) فرشتے نازل ہوتے |
| وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا | ہیں کہ تم نہ خوف کھاؤ اور نہ غم کرو، تمہارے |
| بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ | لیے اس جنت کی بشارت ہے جس کا تم |
| نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ | سے وعدہ کیا جا رہا تھا۔ ہم دنیا کی زندگی |
| الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ | میں بھی تمہارے دوست رہے ہیں اور |
| وَلَکُمْ فِیْہَا مَا تَشْتَہِیْٓ | آخرت میں بھی رہیں گے۔ تمہارے لیے |
| اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْہَا | وہاں وہ سب کچھ ہے جو تمہارا جی چاہے |
| مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ | گا اور تمہارے لیے وہ سب کچھ ہے جو |
| غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ ۝ | تم طلب کرو گے۔ یہ غفور و رحیم خدا کی |
| (فصّلت: ۳۰-۳۲) | طرف سے میزبانی ہوگی۔ |

مخالف ماحول میں استقامت پر جنت کی یہی خوشخبری ایک اور جگہ ان الفاظ میں دی گئی ہے۔

| | |
|---|---|
| اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ | بے شک وہ لوگ جنھوں نے کہا کہ |
| ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ | ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر استقامت |
| عَلَیْہِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ | دکھائی ان کے لیے نہ خوف ہے اور نہ وہ |
| اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ | غم گین ہوں گے۔ یہ جنت والے ہیں اس |
| خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ج جَزَآءً بِمَا | میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ان کے ان اعمال |
| کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ (الاحقاف: ۱۳-۱۴) | کی جزا ہوگی جو وہ انجام دے رہے تھے۔ |

اللہ کے دین پر استقامت کا ایک پہلو یہ ہے کہ آدمی مخالف ماحول میں اس کے دین کی طرف مسلسل دعوت دیتا رہے، اس کا حق ہونا ثابت کرے، اس کے بارے میں جو شکوک وشبہات اور غلط فہمیاں پائی جائیں انھیں دور کرے اور اس بات پر مطمئن کرنے کی سعی کرے کہ وہی فلاح دارین کا واحد ذریعہ ہے۔ ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| فَلِذٰلِکَ فَادْعُ ج وَاسْتَقِمْ | پس تم (سابقہ پیغمبروں کے) اسی دین |
| کَمَآ اُمِرْتَ ج وَلَا تَتَّبِعْ | کی طرف دعوت دو اور اسی طرح ثابت قدم |
| اَھْوَآءَھُمْ ج وَقُلْ اٰمَنْتُ | رہو جس طرح حکم دیا گیا ہے۔ ان کی |
| بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتٰبٍ | خواہشات کی پیروی نہ کرو اور کہو کہ میں |
| وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ ط | ایمان لاتا ہوں ہر اس کتاب پر جو اللہ |
| اَللّٰہُ رَبُّنَا وَرَبُّکُمْ ط لَنَآ | نے نازل کی ہے۔ مجھے تمہارے درمیان |
| اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ | عدل کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ ہمارا رب |
| لَا حُجَّۃَ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ ط | اور تمہارا رب ہے۔ ہمارے لیے ہمارے |
| اَللّٰہُ یَجْمَعُ بَیْنَنَا وَاِلَیْہِ | اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال |
| الْمَصِیْرُ ۝ | ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی حجت |
| | نہیں ہے۔ اللہ ہم سب کو جمع کرے گا |
| (الشوریٰ: ۱۵) | اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ |

اس آیت سے ایک بات یہ نکلتی ہے کہ غیر اسلامی ریاست میں دعوت وتبلیغ کو اسلام اپنا ایک بنیادی حق قرار دیتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے یہ حق حاصل رہے،

تاکہ جو شخص اسلام کو اللہ کے دین کی حیثیت سے قبول کرنا چاہے اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ آج کے دور میں اس حقیقت کو تسلیم کرلیا گیا ہے کہ کسی بھی عقیدہ کو قبول کرنا، اس کے مطابق عمل کرنا اور اس کی تبلیغ کرنا ہر شہری کا بنیادی حق ہے۔

اس آیت سے دعوت کے بعض بنیادی اصول بھی سامنے آتے ہیں۔ ان کی رعایت ضروری ہے۔

## دین میں تبدیلی نہ ہوگی

غیر اسلامی ریاست میں دین کو بدلنے اور اسے مسخ کرنے کی کوشش بھی ہوسکتی ہے تاکہ اس کی انفرادیت اور امتیاز باقی نہ رہے اور وہ غیر اسلامی فکر اور تہذیب سے ہم آہنگ ہوجائے۔ اس کے لیے با اقتدار طبقہ اپنی خواہش کے مطابق دین کی توجیہ وتفسیر کرکے اسے قبول کرنے پر مجبور کرسکتا ہے، اس کا موقع نہ ہو اور حکمت و مصلحت اس کی اجازت نہ دے تو خود دین کے ماننے والوں کے سامنے اس میں ترمیم و تنسیخ کا مطالبہ رکھا جاسکتا ہے۔ یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے۔ اس کے لیے معاشی اور سیاسی دباؤ، ترغیب اور لالچ، قانون سازی غرض مختلف تدبیریں اختیار کی جاسکتی ہیں۔ یہ مذہبی جبر و اکراہ کی ایک بدترین شکل ہے۔ اسے اسلام کبھی قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ مشرکین مکہ کے اس مطالبہ کو کہ قرآن میں تبدیلی کرکے اُن کے باطل عقائد کو بھی اس میں جگہ دی جائے تاکہ وہ ان کے لیے قابلِ قبول ہوسکے، قرآن نے یکسر رد کردیا اور کہا کہ اللہ کی کتاب میں ایک لفظ کی ترمیم و تنسیخ یا حذف و اضافہ ممکن نہیں ہے۔ اس کے ماننے والے اس کی اتباع کے پابند ہیں۔ اسے بدلنے کا اللہ نے انھیں کوئی حق نہیں دیا ہے۔ ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا | اور جب ہماری واضح آیات اُن کو |
| بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ | پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم |
| لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ | سے ملاقات کی توقع نہیں رکھتے، کہتے |
| هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۭ قُلْ | ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن پیش |
| مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ | کرو یا کم از کم اس میں تبدیلی کردو۔ ان |
| مِنْ تِلْقَاۗئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ | سے کہو کہ میں اس میں اپنی طرف سے |

| | |
|---|---|
| اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ | کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔ میں تو اس وحی |
| اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ | کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر کی جاتی ہے۔ |
| رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ | اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے |
| (یونس: ۱۵) | بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔ |

اس معاملہ میں مشرکین کی طرف سے جو دباؤ تھا اس کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَاِنْ کَادُوْا لَیَفْتِنُوْنَکَ | کچھ بعید نہ تھا کہ یہ تمہیں فتنہ میں ڈال |
| عَنِ الَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ | کر اس وحی سے ہٹا دیتے جو ہم نے تم پر |
| لِتَفْتَرِیَ عَلَیْنَا غَیْرَہٗ | کی ہے تاکہ تم اس کے سوا کوئی دوسری |
| وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْکَ | چیز گھڑ کر ہماری طرف منسوب کردو۔ اس |
| خَلِیْلًا ۝ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰکَ | صورت میں وہ تمہیں ضرور اپنا دوست |
| لَقَدْ کِدْتَّ تَرْکَنُ اِلَیْھِمْ | بنا لیتے۔ اگر ہم تمہیں ثابت قدم نہ رکھتے |
| شَیْئًا قَلِیْلًا ۝ اِذًا لَّاَذَقْنٰکَ | تو تم کچھ نہ کچھ ان کی طرف جھک جاتے |
| ضِعْفَ الْحَیٰوۃِ وَضِعْفَ | اس وقت ہم تمہیں دنیا میں بھی دوگنا |
| الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ | عذاب اور موت کے بعد بھی دوگنا عذاب |
| عَلَیْنَا نَصِیْرًا ۝ | دیتے۔ پھر تم ہمارے مقابلے میں کوئی |
| (بنی اسرائیل: ۷۳۔۷۵) | مددگار نہ پاتے۔ |

اللہ کے دین میں ردّوبدل اور ترمیم کی اس نے اپنے ماننے والوں کو اجازت دی ہے اور نہ کسی دوسرے کو۔ اہلِ ایمان کی ذمہ داری ہے کہ اس قسم کے ہر مطالبہ کو رد کردیں اور ایسی ہر کوشش کو ناکام بنا دیں۔

## اقامتِ صلوٰۃ

نماز دین کا ستون ہے۔ اس کی ہر حال میں اور ہر جگہ پابندی ہونی چاہیے۔ نازک حالات میں یہ مومن کی قوت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ قرآن مجید نے ہدایت کی ہے کہ مشکلات میں صبر اور نماز سے مدد حاصل کی جائے۔ ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ | اور مدد طلب کرو صبر اور نماز سے۔ |

وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ ۝ (البقرہ: ۴۵)
اور بے شک وہ بھاری ہے مگر ان لوگوں پر نہیں جن کے دلوں میں خشوع ہے۔

فرعون نے بنو اسرائیل پر مظالم کے پہاڑ توڑ رکھے تھے، ان کی نسل کشی جاری تھی، وہ غلامی اور محکومی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، ان کی عورتوں کی بے حرمتی اور آبرو ریزی ہو رہی تھی، وہ ایک نہیں متعدد زیادتیوں کے شکار اور انسانی حقوق سے سراسر محروم تھے۔ ان سخت ترین حالات میں حضرت موسیٰؑ نے انہیں دین پر ثابت قدم رہنے اور نماز کے ذریعہ استعانت کا حکم دیا۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ
اور مدد طلب کرو صبر اور نماز کے ذریعہ۔
اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (البقرہ: ۱۵۳)
بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ایک اور موقع پر ہدایت فرمائی۔

اِسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا (الاعراف: ۱۲۸)
مدد طلب کرو اللہ سے اور صبر کرو۔

اوپر کی آیت سے واضح ہے کہ یہ نماز اور صبر کے ذریعہ استعانت کا حکم تھا مطلب یہ کہ ان حالات میں صبر سے کام لو۔ بے صبری کا مظاہرہ نہ کرو۔ ہراساں اور خوف زدہ ہو نہ مایوس اور دل شکستہ۔ دین پر پوری قوت سے جمے رہو۔ اس میں نماز سے مدد مل سکتی ہے، اس سے مدد حاصل کرو۔

اقامتِ صلوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے ظاہری شرائط اور تقاضے بھی پورے کیے جائیں اور اس کی روح بھی اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ نماز اس طرح ادا کی جائے جس طرح ادا کرنے کا حکم ہے۔ اوقات کی پابندی ہو، فرائض کے ساتھ سنن و نوافل کا بھی اہتمام ہو۔ نماز میں خشوع و خضوع ہو، اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری کا احساس اور انابت و اخلاص ہو، بلکہ احسان کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح نماز کے ظاہری شرائط اور باطنی کیفیات جب یکجا ہو جاتی ہیں تو اس کے اثرات بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

مسلمانوں کی ہر بستی میں باجماعت نماز کا انتظام ہونا چاہیے۔ اس کے لیے مساجد تعمیر ہوں، انھیں پاک صاف رکھا جائے۔ ان کا بہتر نظم و انصرام ہو۔ یہ اور اس طرح کے

ضروری اقدامات سے اقامتِ صلوٰۃ کا تصور مکمل ہوتا ہے۔

نماز کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے تعلق استوار ہوتا ہے اور باجماعت نماز سے ایک ایسی امّت کا تصور ابھرتا ہے جس کے درمیان مساوات اور برابری ہے، چھوٹے بڑے اور شریف اور رذیل کا فرق نہیں ہے، اس کی صفوں میں اتحاد و اتفاق ہے، وہ انتشار سے محفوظ ہے، اس کا ہر فرد دوسرے کا ہمدرد و غم گسار ہے، امت کے اندر یہ جذبہ صحیح معنی میں پیدا ہو جائے تو اس کا کوئی بھی فرد مشکلات و مصائب میں بے یار و مددگار نہیں محسوس کرے گا بلکہ خود کو ہمدردوں کے درمیان پائے گا، اس طرح امت بڑی سے بڑی مشکل پر قابو پا سکتی ہے۔

## رجوع الی اللہ

اس دنیا میں اہلِ ایمان پر سخت سے سخت آزمائشیں آسکتی ہیں۔ انہیں مشکل اور دشوار گزار حالات سے گزرنا پڑ سکتا ہے۔ کبھی یہ آزمائشیں یہ دیکھنے کے لیے بھی ہوتی ہیں کہ اہلِ ایمان اپنے دعوئ ایمان میں سچے ہیں یا نہیں؟ ان میں کون مخلص ہے اور کون غیر مخلص؟ کون مومنِ صادق ہے اور کون منافق اور ریاکار؟

اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں مکہ کے مسلمان انتہائی صبر آزما اور زہرہ گداز حالات سے گزر رہے تھے۔ آزمائشیں تھیں کہ بارش کی طرح برس رہی تھیں۔ قرآن مجید نے ان حالات میں کہا:

| | |
|---|---|
| اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا | کیا لوگوں نے خیال کر رکھا ہے کہ وہ |
| اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ | یہ کہنے پر کہ ہم ایمان لے آئے چھوڑ دیے |
| لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ | جائیں گے اور ان کی آزمائش نہ ہوگی، |
| مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ | جب کہ ہم نے (ایمان کے دعوے پر) |
| الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ | ان سے پہلے کے لوگوں کو آزمایا ہے۔ |
| الْكٰذِبِيْنَ ۝ | اللہ تو ضرور ان لوگوں کو دیکھے گا جو سچے |
| | ہیں اور ضرور ان لوگوں کو بھی دیکھے گا جو |
| (العنکبوت: ۲-۳) | جھوٹے ہیں۔ |

اسی سلسلۂ بیان میں آگے چل کر فرمایا :

| | |
|---|---|
| وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ | اور اللہ ضرور معلوم کر کے رہے گا ان |
| اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ | لوگوں کو جو (سچے دل سے) ایمان لائے |
| | اور ان لوگوں کو بھی اللہ ضرور معلوم کر کے |
| (العنکبوت : ۱۱) | رہے گا جو منافق ہیں۔ |

اہلِ ایمان کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ وہ ہر طرح کی آزمائشوں میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

| | |
|---|---|
| وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ | اور ضرور ہم تمہیں آزمائیں گے کسی قدر |
| الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ | خوف، بھوک، مالوں، جانوں اور پھلوں |
| الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ | کے نقصان سے۔ (اس پر) صبر کرنے |
| وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (البقرہ : ۱۵۵) | والوں کو خوش خبری دے دو۔ |

اس کے بعد کہا گیا کہ ناسازگار حالات اور مشکلات میں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس وجہ سے دنیا اور آخرت میں وہ اس کی رحمت اور عنایت کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ ان کی قلبی کیفیت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

| | |
|---|---|
| اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ | (صبر کرنے والے وہ ہیں) کہ جب انہیں |
| قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ | کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ بے شک |
| اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ | ہم اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے |
| رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ | والے ہیں۔ ان کے لیے ان کے رب کی |
| هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝ (البقرہ : ۱۵۶-۱۵۷) | طرف سے رحمتیں ہیں اور یہی ہدایت یافتہ ہیں۔ |

مصیبت میں اللہ کی طرف رجوع کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ مومن کو زندہ و توانا فطرت ملتی ہے۔ جب بھی اس پر کوئی نازک گھڑی آتی ہے اور وہ مشکلات سے دوچار ہوتا ہے فوراً اسے اللہ کی طرف رجوع نصیب ہوتا اور وہ اس سے مدد طلب کرتا ہے۔ مصیبت میں بھی کسی کو اللہ کی طرف رجوع نصیب نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی فطرت بے حسی کا شکار ہے۔ وہ اپنی تدبیروں پر اعتماد کرے گا، اللہ کی طرف نہیں پلٹے گا۔ حالانکہ اللہ کی نصرت کے بغیر اس کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔

حالات کی سنگینی اور شدت اور ہماری کم زوری اور ناتوانی اس بات کا شدید تقاضا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا جائے، اس کے ذکر سے دل کو آباد رکھا جائے، اس سے فریاد کی جائے، اس سے دعائیں کی جائیں اور اس سے مدد طلب کی جائے، یہی ایک مومن کا کردار ہے۔ اس سے امید ہے ہماری تدبیریں کارگر ہوں گی، اللہ تعالیٰ کی نصرت وحمایت حاصل ہوگی اور مشکلات رفع ہوں گی

| | |
|---|---|
| اِنْ یَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا | اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی |
| غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ یَّخْذُلْكُمْ | تم پر غالب نہ آسکے گا اور اگر وہ تمہیں |
| فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُكُمْ | چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو |
| مِنْۢ بَعْدِهٖ ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ | تمہاری مدد کرے؟ اور اللہ ہی پر ایمان |
| الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (آل عمران: ۱۶۰) | والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے۔ |

## امر بالمعروف ونہی عن المنکر

اس دنیا میں عام انسانوں کے درمیان ایک مسلمان کو جو کردار ادا کرنا ہے اسے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کہا گیا ہے۔ یہ بڑا وسیع اور ہمہ جہت کام ہے۔ معروف میں صحیح عقیدہ اور فکر، اعلیٰ اخلاقیات، انسانی حقوق، مساوات اور عدل و انصاف جیسی وہ تمام خوبیاں آتی ہیں جنہیں اللہ کے دین کی سند حاصل ہے اور جن کے معروف ہونے کی عقل اور فطرت شہادت دیتی ہے۔ 'منکر' اس کے برخلاف فکری وعملی رویے کو کہا جاتا ہے۔ اس میں باطل عقائد وافکار، غلط اخلاقیات، نوعِ انسانی یا اس کے کسی بھی طبقہ کی توہین، جبر وتشدد اور ظلم وزیادتی جیسا کردار شامل ہے۔ یہ وہ کردار ہے جسے اللہ کے دین کی منظوری حاصل نہیں ہے اور جسے انسان کی فطرت اور عقلِ سلیم ناپسندیدہ اور غلط قرار دیتی ہے۔

'امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' کا اولین تقاضا یہ ہے کہ دنیا کو شرک، کفر اور الحاد کے نقصانات سے آگاہ کیا جائے اور اسلام کے توحید خالص کے تصور کو دلائل کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اس وقت پوری دنیا کو مادہ پرستی نے اپنے شکنجے میں بری طرح کس رکھا ہے۔ اس کی ذہنی اور فکری تربیت خالص مادّی نقطۂ نظر سے ہو رہی ہے۔ اس کی

اخلاقیات، معاشرت، معیشت اور سیاست اسی کے تابع ہے۔ ذاتی اور گروہی مفادات کے ٹکراؤ کی وجہ سے دنیا جہنم کدہ بنی ہوئی ہے۔ روحانی اور اخلاقی قدریں بری طرح پامال ہو رہی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہر فرد اور ہر گروہ نے ظلم و تشدد، ناانصافی اور مکر و فریب کو بغیر کسی جھجک کے راہِ عمل قرار دے لیا ہے اور قدم قدم پر انسانی حقوق پامال ہو رہے ہیں۔

اس کے بالکل برعکس اسلام انسان کے مادی اور روحانی تقاضوں کی بہتر تکمیل کرتا ہے، اس کا بنیادی تصور یہ ہے کہ تمام انسان اللہ کے بندے ہیں اور انہیں صرف اسی کی عبادت کرنی چاہیے اور اسی کی ہدایات کا پابند ہونا چاہیے۔ یہ کسی قوم یا کسی ملک کا دین نہیں ہے۔ اس کا خطاب ہر فرد بشر سے ہے۔ وہ سب کے لیے دنیا اور آخرت کی کامیابی کی راہیں کھولتا ہے۔ وہ صحیح معنی میں انسان کے لیے دینِ رحمت ہے۔

امر بالمعروف یہ ہے کہ دنیا کو حق و صداقت کی، امن و آشتی کی، دیانت و امانت کی، عفت و عصمت کی اور تمام ہی اعلیٰ اخلاقیات کی تعلیم دی جائے۔ امر بالمعروف یہ ہے کہ ایک دوسرے کے حقوق بیان کیے جائیں اور انہیں ادا کرنے کی ترغیب دی جائے۔ ایک ایک فرد کے ذہن میں یہ حقیقت ذہن نشین کرائی جائے کہ دنیا کا ہر فرد کچھ حقوق رکھتا ہے، ان حقوق کی پاس داری لازم ہے۔ عزیزوں اور قرابت داروں ہی کے نہیں، پڑوسیوں کے، اجنبیوں اور مسافروں کے، عقیدہ اور مذہب میں اختلاف رکھنے والوں کے، ہم وطنوں اور دوسرے وطن والوں کے بھی حقوق ہیں۔ ان کی جان، مال اور عزت و آبرو کی لازماً حفاظت ہونی چاہیے۔ اس کے برخلاف جھوٹ، بددیانتی، وعدہ خلافی، زناکاری اور بے حیائی جیسے اخلاق سے گرے ہوئے تمام اعمال منکر ہیں۔ اسی طرح ظلم، حق تلفی، احسان فراموشی، خوں ریزی، قتل و غارت گری اور انسانی حقوق کی پامالی بھی منکرات میں آتے ہیں۔ ان سے باز رکھنے کی کوشش ہونی چاہیے۔

اسلام چاہتا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اس عظیم فرض کو ادا کرنے کے لیے امت مسلمہ کھڑی ہو جائے اور اس کا ہر فرد اس کے لیے اپنی طاقت اور اثرات کو ممکنہ حد تک استعمال کرے۔ جو شخص وعظ و نصیحت کر سکتا ہے وہ وعظ و نصیحت اور ترغیب و تشویق کے ذریعہ نیکیوں کو پھیلائے اور برائیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرے جس کے لیے

درس وتدریس اور تعلیم کے مواقع حاصل ہیں وہ اس راہ سے یہ فرض ادا کرے۔ ایک مسلمان جس دائرہ میں بھی 'امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' کا فرض انجام دے سکتا ہے۔ اس کی کوشش ہونی چاہیے کہ اس دائرہ میں یہ فرض ضرور انجام پائے۔ اس کے لیے وقت ضرورت ذاتی اور سماجی اثر ورسوخ اور سیاسی طاقت کا استعمال بھی صحیح ہوگا۔ کسی کو یہ طاقت ہوگی کہ اپنے گھر اور خاندان کو معروفات کا پابند بنائے اور منکرات سے باز رکھ سکے، کوئی اس حیثیت میں ہوگا کہ اپنی بستی میں معروفات قائم کرسکے اور منکرات مٹا سکے، کسی کو اپنے شہر میں اس پر عمل کا موقع اور استطاعت حاصل ہوگی اور کوئی حکومت کی سطح پر اسے انجام دینے کے موقف میں ہوگا۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ امتِ مسلمہ 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کے لیے کھڑی ہوجائے۔ اس کا ہر فرد نیکیوں کے لیے ماحول کو سازگار بنانے اور برائیوں کے خلاف ماحول کو تیار کرنے میں اپنی سی جدوجہد کرے۔ یہ وہ کام ہے جسے اس امت کو اسلامی ریاست میں میں بھی انجام دینا ہے اور غیر اسلامی ریاست میں بھی۔ اسی سے اس کا تشخص اور امتیازی حیثیت باقی رہے گی اور وہ اللہ کی رحمت کی مستحق ہوگی۔

## عدل پر قائم رہنا اور عدل قائم کرنا

اسلام نے ہر حال میں عدل وانصاف پر قائم رہنے اور اس کی پابندی کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ہے:

قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ (الاعراف: ۲۹) — تم کہہ دو میرے رب نے عدل وقسط کا حکم دیا ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ (النحل: ۹۰) — بے شک اللہ حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا اور قرابت داروں کو (ان کا حق) دینے کا اور کھلی بے حیائی، منکر اور ظلم سے منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے، شاید تم نصیحت حاصل کرو۔

یہاں عدل واحسان کے حکم کے ساتھ بغی وعدوان سے منع بھی کیا گیا ہے۔ یہ

دونوں لازم وملزوم ہیں۔ جہاں عدل وانصاف ہوگا ظلم وزیادتی قدم نہ جما سکے گی اور جہاں ظلم کی حکم رانی ہوگی عدل رخصت ہو جائے گا۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو ایک ایسی امت کی حیثیت سے ابھارا ہے جو اللہ کے دین کی علم بردار ہوگی اور دنیا میں عدل وانصاف کی شہادت دے گی۔ وہ انہیں اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی فرد یا گروہ پر دستِ تعدی دراز کریں، چاہے اس سے کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں اور اس نے کتنی ہی زیادتی کیوں نہ کی ہو۔ عدل وانصاف تقویٰ کی علامت ہے اور مسلمان کسی حال میں تقویٰ اور خدا ترسی کا دامن نہیں چھوڑ سکتا۔ قرآن مجید میں یہ بات بڑی وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔

| | |
|---|---|
| يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا | اے ایمان والو اللہ کے لیے کھڑے |
| قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ | ہونے والے بن جاؤ، عدل وانصاف کی |
| بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ | گواہی دینے کے لیے کسی قوم کی دشمنی تمہیں |
| شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا | اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کی راہ |
| اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ | سے ہٹ جاؤ۔ انصاف کرو یہ تقویٰ سے |
| لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ | قریب تر روش ہے اور اللہ سے ڈرتے |
| اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝ | رہو۔ اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے |
| (المائدہ: ۸) | باخبر ہے۔ |

قرآن مجید نے یہ حقیقت بھی کھول کر رکھ دی ہے کہ جب کوئی قوم اللہ کی نافرمانی اور ظلم وزیادتی کی راہ اختیار کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ایک وقتِ خاص تک مہلت دیتا ہے۔ پھر اس کی مہلت ختم ہو جاتی اور وہ اللہ کے عذاب کی مستحق قرار پاتی ہے۔ اس کے ثبوت میں وہ تاریخ کا حوالہ دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

| | |
|---|---|
| وَكَذَٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ | تمہارے رب کی پکڑ اسی طرح |
| إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ ظَالِمَةٌ | ہوتی ہے، جب کہ وہ ظلم کی راہ پر |
| إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ ۝ | چلنے والی بستیوں کو پکڑتا ہے۔ بے شک |
| (ہود: ۱۰۲) | اس کی پکڑ دردناک اور سخت ہے۔ |

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی اس سنت کا ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے:

ان اللہ لیملی للظالم حتیٰ اذا اخذہ لم یفلتہ[1]

بے شک اللہ تعالیٰ ظالم کو ضرور مہلت دیتا ہے لیکن جب اسے پکڑتا ہے تو اسے چھوڑتا نہیں ہے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مظلوم کی آہ سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ آپ نے حضرت معاذؓ کو یمن کے گورنر کی حیثیت سے روانہ فرمایا تو بعض نصیحتیں فرمائیں۔ ان میں ایک نصیحت یہ تھی:

واتق دعوۃ المظلوم فانہ لیس بینہا وبین اللہ حجاب[2]

مظلوم کی دعا سے بچو اس لیے کہ اس دعا اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے۔

حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ایاک دعوۃ المظلوم فانما یسأل اللہ تعالیٰ حقہ واللہ لا یمنع ذا حق حقہ[3]

مظلوم کی دعا سے بچو، اس لیے کہ وہ تو اللہ تعالیٰ سے اپنا حق مانگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی حق دار کو اس کے حق سے منع نہیں کرتا۔

اسی مضمون کی ایک اور حدیث میں فرمایا گیا ہے مظلوم چاہے غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو اس کی بد دعا سے بچو[4] اس کا مطلب یہ ہے کہ مظلوم کوئی بھی ہو اور اس پر کسی بھی قسم کی زیادتی ہوئی ہو اللہ تعالیٰ اس کی دعا ضرور سنے گا اور یقیناً اس کی مدد کرے گا۔

مظلوم جب اس احساس کے ساتھ اللہ کو پکارتا ہے کہ ظالم کے مقابلہ کی اس میں طاقت نہیں ہے۔ صرف وہی اس کی مدد اور اس کے حقوق کی حفاظت کر سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے دربار میں اس کی فریاد بغیر کسی رکاوٹ کے پہونچتی ہے اور اس کے لیے درِ اجابت کھل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی حق دار کو اس کے حق سے محروم نہیں کرتا۔

---

[1] بخاری، کتاب التفسیر (سورۃ ہود) باب کذلک اخذ ربک الآیہ۔ مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب تحریم الظلم۔

[2] بخاری، کتاب المظالم، باب الاتقاء والحذر من دعوۃ المظلوم، مسلم، کتاب الایمان، باب الدعا الی الشہادتین۔

[3] مشکوٰۃ، کتاب الادب، باب الظلم بحوالہ بیہقی۔

[4] مناوی، التیسیر بشرح الجامع الصغیر: ۱/ ۴۰۵

ایک اور روایت میں ظلم کرنے ہی سے نہیں ظالم کا ساتھ دینے، اس کی تائید و حمایت کرنے اور اسے تقویت پہونچانے پر شدید وعید آئی ہے۔ چنانچہ حضرت اوس بن شرحبیلؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا ہے:

| | |
|---|---|
| من مشیٰ مع ظالم | جو شخص کسی ظلم کے ساتھ چلے تاکہ اسے |
| لیقویہ وھو یعلم انہ ظالم | تقویت پہونچائے اور وہ جانتا بھی ہو کہ وہ |
| فقد خرج من الاسلام[1] | ظالم ہے تو وہ اسلام (کے طریقہ) سے نکل گیا۔ |

اس کا مطلب یہ ہے کہ جانتے بوجھتے ظلم کی تائید کرنا اور ظالم کی حمایت میں کھڑا ہوجانا کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے، یا یہ کہ یہ اہلِ ایمان کی روش نہیں ہے۔ ظلم کی تائید کرکے آدمی ان کے طریقہ سے ہٹ جائے گا۔

یہ حقیقت امت کے ہر فرد کے ذہن میں ہمیشہ تازہ رہنی چاہیے کہ وہ عدل و قسط کا داعی اور منادی ہے۔ اس نے ظلم کی راہ اختیار کی تو اسلام کی صریح تعلیمات کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوگا اور اللہ کے غضب کو دعوت دے گا۔ مسلمان جہاں کہیں بھی ہو اور جس سماج میں بھی ہو، اس کا دامن ظلم و زیادتی سے پاک ہونا چاہیے۔ وہ کسی پر دست درازی نہ کرے، کسی ظالم کا ساتھ نہ دے بلکہ ظلم کے خلاف محاذ آرا رہے۔

## دفاع کا حق

ہر انسان کا یہ فطری حق ہے کہ اپنی جان، مال، جائیداد اور عزت و آبرو کی حفاظت کرے اور کسی طرف سے اس پر حملہ ہو تو اس کا دفاع کرے۔

انسان کا گھر اور خاندان اس کا اپنا ہے۔ اسے اپنے بیوی بچوں، ماں باپ اور افرادِ خاندان سے جذباتی تعلق ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات وہ اپنی ذات سے زیادہ ان سے محبت کرتا ہے۔ اس پر ان کی اخلاقی اور قانونی ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں۔ اس کا یہ حق ہے کہ انھیں ظلم و زیادتی کا شکار ہونے نہ دے اور ان پر کسی قسم کی درازدستی یا حملہ ہو تو ان کا دفاع کرے۔ بعض صورتوں میں اپنا اور اہلِ خاندان کا دفاع آدمی پر واجب ہوجاتا ہے۔

---

[1] مشکوٰۃ، کتاب الادب، باب الظلم بحوالہ بیہقی ورواہ الطبرانی والضیاء المقدسی وضعف المنذری التیسیر لشرح الجامع الصغیر ۲/۴۵

اسی طرح ایک مہذب سماج کے ہر فرد کا یہ حق ہے کہ وہ مظلوم کا دفاع کرے اور ظالم کا جواب دے۔ اگر کسی کے گھر ڈاکو گھس آئیں اور اس پر حملہ آور ہوں اور اس کا مال و اسباب لوٹنے لگیں تو خود اسے بھی دفاع کا حق ہے اور پاس پڑوس کے لوگوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ اس کی مدد کریں اور اسے ظلم و زیادتی سے بچائیں۔ اس میں اگر حملہ آور مارا جائے تو دفاع کرنے والے کی کوئی ذمہ داری نہ ہوگی۔ اس لیے کہ حملہ آور ایک مجرم ہے اور دفاع کرنے والے کا کوئی جرم نہیں ہے۔ وہ اسے جرم سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن اگر دفاع کرنے والا اس کوشش میں مارا جائے تو وہ ہمدردی کا مستحق ہوگا اور اس کی اخلاقی اور قانونی مدد ضروری ہوگی۔

دفاع کے اس حق کو دنیا کا ہر مہذب قانون تسلیم کرتا ہے۔ اسلام نے بھی اسے ایک بنیادی حق کے طور پر مانا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کو اپنی جان، مال، عزت آبرو اور اپنے خاندان کے دفاع کا پورا حق حاصل ہے۔ ایک مسلمان کی جان اس راہ میں چلی جائے تو وہ شہادت کا مقام حاصل کرے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ یہاں ایک روایت پیش کی جا رہی ہے۔ حضرت سعید بن زیدؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا ہے:

| | |
|---|---|
| من قُتل دون ماله فهو | جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا |
| شهيد ومن قُتل دون دينه | جائے وہ شہید ہے، جو اپنے دین کی حفاظت میں |
| فهو شهيد ومن قُتل دون | مارا جائے وہ شہید ہے، جو اپنے نفس کی حفاظت |
| دمه فهو شهيد ومن قُتل | میں مارا جائے وہ شہید ہے اور جو اپنے گھر والوں |
| دون اهله فهو شهيد[1] | کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔ |

دفاع کے سلسلہ میں دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ یہ ذمہ داری اصلاً ریاست کی ہے کہ وہ شہریوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرے کسی شہری یا شہریوں کے کسی گروہ کو اپنے دفاع کی اس وقت ضرورت پیش آتی ہے جب کہ اچانک حملہ ہو اور ریاست کو اپنی ذمہ داری ادا کرنے

---

[1] ترمذی، کتاب الدیات، باب ماجاء فی من قتل دون ماله فهو شهید

کا موقع نہ ملے یا وہ اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کرے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جہاں انسان یہ دیکھے کہ اس کے جان و مال یا بنیادی حقوق کو خطرات لاحق ہیں، پہلے حکومت کو اس کی ذمہ داری یاد دلائے اور اس کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن اگر اس کا موقع نہ ہو یا حکومت کی طرف سے غفلت برتی جائے تو آدمی دفاع کا پورا حق رکھتا ہے۔

۲۔ دفاع میں اس بات کا بھی خیال رکھا جائے گا کہ طاقت کا کم سے کم استعمال ہو۔ اگر حملہ آور صرف ڈرانے دھمکانے یا شور مچانے سے فرار کی راہ اختیار کرلے تو اسے زخمی کرنے یا قتل کرنے کی کوشش نہیں ہوگی۔ اس کی جان اسی وقت لی جائے گی جب کہ اس کے سوا کوئی دوسری تدبیر کارگر نہ معلوم ہو۔

دفاع کا حق ایک تسلیم شدہ حق ہے۔ اس سے سماج کے کمزور ترین فرد کو بھی یہ حوصلہ ملتا ہے کہ اس کی جان، مال اور بیوی بچے ظالموں کے رحم و کرم پر نہیں ہیں۔ وقتِ ضرورت اگر اسے ریاست کی یا قریب کے کسی فرد کی مدد نہ بھی ملے تو وہ خود اپنے بل پر اپنی، اپنی جائیداد اور اپنے خاندان کی حفاظت کرسکتا ہے۔ ایک مسلمان نازک اور مخدوش حالات میں اپنے اس حق کا استعمال کرتا ہے تو اسلام کی تعلیم پر بھی عمل کرتا ہے اور وقت کے قانون کی بھی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

## انتقام کا حق

اسلام ظلم و زیادتی کو کسی حال میں روا نہیں رکھتا۔ وہ اس کا ہر طرح سے سدِّباب چاہتا ہے۔ اسی کا ایک پہلو یہ ہے کہ کسی پر ظلم ہوا یا اس کا کوئی نقصان ہوا ہے تو وہ مجرم سے انتقام کا حق دیتا ہے۔ قرآن مجید نے بڑے نازک اور مشکل حالات میں انسان کے اس حق کا اعلان کیا۔

سورۂ شوریٰ مکہ میں نازل ہوئی، جہاں مسلمان گوناگوں زیادتیوں کے شکار تھے اور سخت مشکلات اور آزمائشوں کے ماحول میں زندگی گزار رہے تھے۔ اس سورہ میں ایک جگہ اہلِ ایمان کی ستائش کی گئی ہے کہ ان کے اندر اللہ تعالیٰ پر ایمان، اس پر اعتماد اور توکل ہوتا ہے، ان کا دامن کبائر سے آلودہ نہیں ہوتا، کسی کے غلط رویہ

سے ان کے اندر طیش اور غصہ ابھرتا ہے تو وہ عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں۔ وہ اللہ کی پکار پر لبیک کہتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات باہم مشورہ سے انجام دیتے ہیں اور خدا کی راہ میں انفاق کرتے ہیں۔ ان خوبیوں کے ذکر کے بعد فرمایا۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ (الشوریٰ: ۳۹) وہ کہ جن پر ظلم ہوتا ہے تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔

اس سے بعض باتیں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ یہ خیال غلط ہے اور آیت سے اس غلط خیال کی تردید ہوتی ہے کہ اللہ کے نیک بندے کم زور، ناتواں، بزدل اور کم ہمت ہوتے ہیں۔ ان کو جو چاہے ظلم کا نشانہ بنا سکتا ہے، بلکہ خدا ترس اور متقی انسان وہ ہیں جو ظلم کے سامنے سپر نہیں ڈالتے، وہ ظالم کا مقابلہ کرتے ہیں، وہ لقمۂ تر نہیں ہوتے کہ جو چاہے انھیں ہڑپ کر جائے۔ کوئی ان پر زیادتی کرتا ہے تو اس کا جواب دیتے ہیں۔ یہ ان کی نیکی اور تقویٰ کے منافی ہرگز نہیں ہے۔ سماج کے نیک اور صالح افراد کے بارے میں اگر یہ تصور عام ہو جائے کہ وہ مجبورِ محض ہوتے ہیں اور کسی بھی زیادتی کا جواب دینا ان کے بس میں نہیں ہے تو مخالف ماحول میں ان کا زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا اور معاشرہ پر اس کا انتہائی خراب اثر پڑے گا کہ لوگ بے بسی اور ناتوانی کو نیکی اور تقویٰ کی لازمی خصوصیت سمجھنے لگیں گے۔

انتقام کا مطلب ہے زیادتی کا بدلہ لینا۔ اس کا سوال اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ کسی پر ظلم ہو۔ کسی بے گناہ اور معصوم پر دست درازی کرنا انتقام نہیں صریح ظلم ہے۔ اہلِ ایمان کا دامن اس سے پاک ہوتا ہے البتہ ان پر ظلم ہو تو ان کو بدلہ لینے کا حق ہے اور اس حق کے استعمال کو کسی بھی طرح ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ بعض حالات میں یہ پسندیدہ قرار پاتا ہے۔

اسلام نے انتقام کا حق تسلیم کرنے کے ساتھ اس بات کا پابند بنایا ہے کہ ظلم زیادتی جتنی ہوئی ہے انتقام بھی اتنا ہی ہو۔ اس حد سے آگے بڑھنا خود ایک ظلم اور قابلِ مواخذہ جرم ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ کسی نے ایک طمانچہ مارا تو انتقام میں اس کا ہاتھ ہی قلم کر دیا جائے، یا بدزبانی کی تو اس کے دانت توڑ دیے جائیں۔ اس ظلم کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید کی ہدایات بہت واضح ہیں۔ ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ | پس جس نے تم پر زیادتی کی تو تم بھی |
| فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ | اسی جیسی زیادتی کرو جیسی اس نے زیادتی |
| مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ ۰ وَاتَّقُوا اللّٰهَ | کی ہے (اس سے زیادہ نہیں) اور اللہ سے |
| وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ | ڈرتے رہو اور خوب جان لو کہ اللہ ان |
| الْمُتَّقِیْنَ ۰ (البقرہ : ۱۹۴) | لوگوں کے ساتھ ہے جو اس سے ڈرتے ہیں۔ |

قرآن مجید نے انتقام کی اس حد کو واضح کرنے کے لیے 'قصاص' کا لفظ استعمال کیا ہے جس کی رُو سے یہ بات غلط ہے کہ ایک شخص کے بدلے میں دس افراد کی جان لی جائے، عورت قتل ہوئی تو مرد کو قتل کیا جائے۔ غلام نے قتل کا ارتکاب کیا ہے تو اس کے بدلہ میں آزاد کو تہ تیغ کر دیا جائے۔ (البقرہ : ۱۷۸) قانونِ قصاص کی بعض دفعات توریت کے حوالہ سے بیان بھی ہوئی ہیں۔ (المائدہ: ۴۵) احادیث میں اور علماءِ شریعت کے ہاں اس کی مزید تفصیلات ملتی ہیں۔

انتقام لینے کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں :

۱۔ زیادتی کا بروقت اس حد تک جواب دیا جا سکتا ہے جس حد تک زیادتی ہوئی ہے۔

۲۔ انتقام میں شرعی اور اخلاقی حدود کی پابندی ضروری ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص نے کسی کو، اس کے ہاتھ پیر، کان ناک کاٹ کر ہلاک کیا، یا میت کا مثلہ کیا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تو انتقام کے نام پر قاتل کے ساتھ یہ رویہ نہیں اختیار کیا جائے گا، بلکہ قاتل کو قانون کے مطابق صرف قتل کی سزا دی جائے گی۔ اسی طرح کسی نے کسی عورت کے ساتھ زنا کیا تو اس کا انتقام یہ نہیں ہے کہ اس کی بیوی یا بیٹی کے ساتھ یہ حرکت کی جائے، بلکہ اسے ازروئے قانون زنا کی سزا دی جائے گی۔

۳۔ زبانی زیادتیوں کا بھی جواب دیا جا سکتا ہے۔ اس میں بھی اخلاقی حدود کی پابندی کرنی ہوگی۔ ان حدود سے آگے بڑھنا ناجائز ہے۔ جیسے کسی نے دشنام طرازی کی تو اس کے جواب میں دشنام طرازی کی جائے، یا تہمت اور افترا پردازی ہونے لگے یا پورے خاندان ہی پر تبرا شروع کر دیا جائے۔

۴۔ ظلم و زیادتی کے خلاف احتجاج کرنا اور آواز اٹھانا جائز ہے تاکہ ظالم کا ظالم ہونا بے نقاب ہو اور مظلوم کو سماج سے مدد ملے۔

۴۔ انتقام کے لیے ریاستی قانون کی مدد لی جائے۔ انتقام کی بہت سی صورتیں وہ ہوسکتی ہیں کہ قانون کی مدد ہی سے ان پر عمل ہوسکتا ہے، اسے نظر انداز کرکے قانون کو ہاتھ میں نہیں لیا جائے گا۔

اس طرح کی اور بھی شرائط ہیں، انہیں پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

## عفو پسندیدہ ہے

مظلوم کو ظالم سے انتقام لینے کا حق ضرور ہے لیکن اس کے لیے فرض اور واجب نہیں ہے۔ وہ اپنے اس حق کو استعمال نہ کرے اور صبر و تحمل اور عفو و درگزر کی روش اختیار کرے تو یہی نتائج کے لحاظ سے بہتر ہوگا۔ یہ اس کی اخلاقی فتح ہوگی اور یہی مطلوب ہے۔ ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| فَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ | اگر بدلہ لو تو اسی قدر بدلہ لو جس قدر |
| مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَلَئِنْ | کہ تم کو تکلیف پہونچائی گئی ہے لیکن اگر صبر |
| صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ | کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے حق میں یقیناً |
| لِّلصّٰبِرِيْنَ ۝ (النحل: ۱۲۶) | بہتر ہے۔ |

اس میں اس بات کی صراحت ہے کہ انتقام ضروری نہیں ہے، لیکن آدمی انتقام لینا ہی چاہے تو جتنی زیادتی ہوئی ہے یا جتنا نقصان پہونچا ہے اسی کے بقدر انتقام لے سکتا ہے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ آدمی صبر سے کام لے۔ سورۂ شوریٰ میں یہ پوری بات زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔

| | |
|---|---|
| وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ | اور برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہے۔ |
| مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ | لیکن جو شخص معاف کرے اور اصلاح |
| فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا | کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ |
| يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَمَنِ | بے شک اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا جو |
| انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ | شخص اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد بدلہ لے |
| مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ؕ اِنَّمَا | تو اس پر کوئی الزام نہیں ہے۔ الزام تو |
| السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ | صرف ان لوگوں پر آتا ہے جو لوگوں پر |

| | |
|---|---|
| النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ | ظلم اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں۔ ان |
| بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ | کے لیے دردناک عذاب ہے۔ جو شخص |
| عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَمَنْ صَبَرَ | (زیادتی پر) صبر کرے اور معاف کردے |
| وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ | تو بے شک یہ بڑی ہمت کے کاموں میں |
| الْاُمُوْرِ ۝ (الشوریٰ: ۴۰-۴۳) | سے ہے۔ |

اس طرح اسلام نے انسان کو ظلم کے انتقام کا قانونی حق بھی دیا اور اس کے ساتھ عفو و درگزر اور اعلیٰ اخلاقی رویہ اختیار کرنے کی ترغیب بھی دی۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ آدمی کو انتقامی کارروائی ناگزیر حالات ہی میں کرنی چاہیئے جب کہ اس سے کوئی بڑا شخصی یا ملّی مفاد وابستہ ہو۔ ورنہ بہتر یہی ہے کہ وہ عفو و درگزر سے کام لے اور معاف کردے۔

قرآن مجید نے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی عفو و درگزر کا رویہ اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے۔ یہود مسلمانوں کے بدترین دشمن تھے، طرح طرح کی سازشوں میں لگے رہے، ان کے متعلق کہا گیا۔

| | |
|---|---|
| وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰي | تمہیں ان کی کسی نہ کسی خیانت کی |
| خَاۗىِٕنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا | اطلاع ہوتی ہی رہتی ہے، البتہ ان میں |
| مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ | سے چند ایک اس سے مستثنیٰ ہیں، تو |
| اصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ | آپ انھیں معاف کردیں اور درگزر کریں۔ |
| الْمُحْسِنِيْنَ ۝ | بے شک اللہ احسان کرنے والوں سے |
| (المائدہ: ۱۳) | محبت کرتا ہے۔ |

یہاں 'عفو' اور 'صفح' دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ دونوں کے معنی تقریباً ایک ہی ہیں[1] اس میں غلط کار کو سزا نہ دینا، غصّے اور غضب کا اظہار نہ کرنا اور لعن طعن سے احتراز کرنا جیسی خوبیاں آتی ہیں۔ یہ گو ایک بڑا اخلاقی رویہ ہے، لیکن اس سے اونچا کردار یہ ہے کہ آدمی زیادتی کرنے والے کو دل سے معاف کردے اور اس کے ساتھ اس

---

[1] القاموس میں ہے صفح کمنع، اعرض وترک۔ اور 'صفح عنہ' کے معنی عفا دئے ہیں۔ اور العفو کے ایک معنی 'الصفح وترک عقوبۃ المستحق' بیان ہوئے ہیں۔ مادہ عفو۔ ص ۱۱۸۱

طرح معاملہ کرے جیسے اس نے زیادتی نہ کی ہو۔ اسلام یہی کردار چاہتا ہے۔
مشرکین کے ساتھ بھی، ان کی تمام زیادتیوں کے باوجود اسی صفح و درگزر کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

| | |
|---|---|
| وَقِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ | رسول کا یہ قول کہ اے رب! |
| هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ | بے شک یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان |
| فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ | نہیں لا رہے ہیں۔ آپ ان سے درگزر |
| سَلٰمٌ ۭ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ | کیجئے اور کہئے کہ تم کو سلام ہے۔ یہ |
| (الزخرف: ۸۸-۸۹) | عن قریب جان لیں گے۔ |

ایک اور موقع پر فرمایا:

| | |
|---|---|
| اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ | بے شک قیامت ضرور آنے والی |
| فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ۝ | ہے۔ پس آپ انہیں اچھی طرح |
| (الحجر: ۸۵) | درگزر فرمائیں۔ |

قرآن مجید نے عفو و درگزر کے ساتھ اصلاح کا بھی حکم دیا ہے۔ سورۂ شوریٰ کی آیات کا حوالہ اس سے پہلے آچکا ہے۔ ان میں سے ایک آیت کا فقرہ یہ ہے۔

| | |
|---|---|
| فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ | پس جس نے معاف کیا اور اصلاح |
| عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ | کی تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ |
| الظّٰلِمِيْنَ ۝ (الشوریٰ: ۴۰) | بے شک وہ ظالموں کو ناپسند کرتا ہے |

اصلاحِ حال کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ تعلقات میں بگاڑ کیوں آیا اور اپنے اصول پر قائم رہتے ہوئے اسے ختم کرنے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے، نفرت اور عداوت کی جگہ محبت کا ماحول کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے؛ اس کے لیے سنجیدہ کوشش کرنی ہوگی۔ اصلاحِ حال کے لیے دشمن کو پہلے معاف کرنا ہوگا اور پھر اس کے بعد اس سے تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کرنی ہوگی۔

## انتقام اور عفو میں سے ہر ایک کا موقع جدا ہے

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ قرآن مجید میں ایک

طرف تو اہل ایمان کی خوبیوں کے ذیل میں کہا گیا ہے کہ ان پر زیادتی ہوتی ہے تو وہ انتقام لیتے ہیں۔ دوسری طرف ان کے صبر اور عفو و درگزر کی تعریف کی گئی ہے۔ کیا ان میں کوئی تضاد نہیں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں کا الگ الگ موقع و محل ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ یہ کوئی قابلِ تعریف بات نہیں ہے کہ معاشرہ میں مسلمان اتنا کم زور اور بے بس ہو کر رہے کہ جو چاہے آسانی سے اس پر دست درازی کر سکے، بلکہ اسے اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ چاہے تو انتقام لے سکے یا معاف کر دے۔ جہاں یہ محسوس ہو کہ عفو و درگزر سے ظالم کا حوصلہ بڑھے گا، بے گناہ اس کی زیادتیوں کا نشانہ بنیں گے وہاں انتقام بہتر ہے تاکہ اس کی ہمت شکنی ہو اور وہ مزید کسی کے ساتھ زیادتی کی جرأت نہ کر سکے، لیکن اگر آدمی یہ دیکھے کہ ظالم کو اپنے ظلم پر ندامت ہے، وہ اپنی غلطی کو محسوس کر رہا ہے، معاف کرنے سے اس پر بہتر اثرات پڑیں گے تو معاف کرنا افضل ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ ظلم کا خاتمہ پیشِ نظر رہے۔ اسی لحاظ سے عفو و درگزر یا انتقام کا معاملہ کیا جائے۔

علامہ ابن عربی مالکی کہتے ہیں کہ سورۂ شوریٰ میں انتصار یا بدلہ لینے کا ذکر ایک قابلِ تحسین عمل کی حیثیت سے آیا ہے۔ دوسرے مقامات پر عفو و درگزر کی تعریف کی گئی ہے۔ اس کی دو توجیہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں سے ایک نے دوسرے کو منسوخ کر دیا ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ ان کو دو مختلف صورتوں پر محمول کیا جائے، (یہی صحیح ہے) ایک صورت یہ کہ باغی یا ظالم علانیہ غلط کاری کر رہا ہو، عام لوگوں سے بدزبانی کرتا ہو، بے حیائی کا مرتکب ہو، چھوٹے بڑے کو ایذا پہنچاتا ہو۔ ایسے شخص سے انتقام لینا افضل ہے۔ اس صورتِ حال کے بارے میں امام نخعیؒ نے کہا ہے کہ وہ (سلف) اسے ناپسند کرتے تھے کہ آدمی خود کو اس قدر ذلیل اور کم زور بنائے رکھے کہ فساق و فجار جری ہو جائیں۔

دوسری صورت یہ کہ غلطی کسی سے اتفاقی طور سے ہو جائے اور وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرے اور معافی کا طالب ہو تو اسے معاف کر دینا افضل ہے۔

علامہ قرطبی نے اس توجیہ کی تعریف کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ کیا طبری نے بھی

یہی توجیہ کی ہے[1]

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ عفو و درگزر کے نتیجہ میں فتنہ دب رہا ہے اور غلط کار اپنی روش سے باز آرہا ہے تو عفو پسندیدہ ہے۔ لیکن اگر عفو و درگزر سے مجرم کا حوصلہ بڑھ جائے اور اس کے غیظ و غضب کو تقویت پہونچے تو انتقام لینا صحیح ہے۔[2]

یہ باتیں بظاہر اسلامی معاشرہ کے پیشِ نظر کہی گئی ہیں۔ غیر اسلامی معاشرہ میں ایک مسلمان کا عام رویہ عفو و درگزر ہی کا ہونا چاہیئے لیکن اسے ایسی صورت حال سے بھی سابقہ پیش آسکتا ہے جب کہ وہ قانون کی حدود میں حقِ انتقام استعمال کرنے اور دادرسی کی کوشش پر مجبور ہو جائے۔

## غصّہ اور اشتعال سے پرہیز

انسان کو ٹھنڈے اور پرسکون مزاج کا ہونا چاہیے۔ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی قدم اٹھانا سخت نادانی ہے۔ اس کی کسی بھی صاحبِ ہوش اور خردمند شخص سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ بعض اوقات قصداً غصّہ دلانے اور مشتعل کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ انسان کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ اس کوشش کو ناکام کردے۔ اشتعال انگیزی اسی لیے ہوتی ہے کہ آدمی بھڑک اٹھے اور بے قابو ہو جائے اور وہ اقدام کر بیٹھے جو ٹھنڈے دل و دماغ والا انسان کبھی پسند نہیں کرے گا۔ اس سے اشتعال دلانے والا فائدہ اٹھاتا ہے اور مشتعل ہونے والا نقصان میں رہتا ہے۔

اہلِ ایمان کی یہ خوبی بیان ہوئی ہے کہ وہ اشتعال میں نہیں آتے، غیظ و غضب کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ کسی کی نازیبا حرکت اور غلط روش پر انھیں غصہ آتا بھی ہے تو عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں۔

وَاِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ — جب انہیں غصہ آتا ہے تو وہ معاف

---

[1] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ج ۸ جزء ۱۶ ص ۲۶ - ۲۷ - دارالکتب العلمیہ لبنان ۱۹۸۸ء

[2] رازی، التفسیر الکبیر: ج ۱۴ جزء ۲۷ ص ۱۵۲ - دارالکتب العلمیہ لبنان ۱۹۹۰ء

يَغْفِرُونَ ۝ (الشوریٰ : ۳۷) کر دیتے ہیں۔

اہلِ ایمان کی جن خوبیوں کی وجہ سے ستائش کی گئی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے :

وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَ — وہ غصہ کو پی جانے والے اور
الْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ (آل عمران: ۱۳۴) — لوگوں کو معاف کر دینے والے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صاحب نے نصیحت کی درخواست کی (غالباً ان میں یہ کمزوری تھی کہ وہ جلد غصہ میں آجایا کرتے تھے) ان کے مناسب حال آپ نے فرمایا 'لَا تَغْضَبْ' (غصہ مت کیا کرو) انہوں نے بار بار یہی درخواست کی اس توقع پر کہ شاید آپ مزید اور کچھ نصیحت فرمائیں گے، لیکن آپؐ نے ہر مرتبہ یہی فرمایا کہ غصہ مت کیا کرو۔[1]

آدمی کی عظمت جسمانی لحاظ سے توانا اور طاقت ور ہونے سے زیادہ اخلاقی لحاظ سے مضبوط ہونے میں ہے۔ وہ اشتعال انگیز حالات میں اپنے جذبات کو جتنا قابو میں رکھے گا اتنا ہی اپنی عظمت کا ثبوت دے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

لیس الشدید بالصرعة — طاقت ور وہ نہیں ہے جو کسی کو پچھاڑ
انما الشدید الذی یملك — دے بلکہ طاقت ور وہ ہے جو غصہ کے
نفسه عند الغضب[2] — وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔

غصہ کا پینا تلخ گھونٹ کا پینا ہے۔ یہ آسانی سے حلق کے نیچے نہیں اترتا لیکن اللہ کو یہ گھونٹ سب سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

ما تجرّع عبد افضل — بندے نے کوئی ایسا گھونٹ
عند الله عزوجل من — نہیں پیا جس کی اللہ عزوجل کے نزدیک
جرعة غیظ یکظمها ابتغاء — غصہ کے اس گھونٹ سے زیادہ

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب الحذر من الغضب ۱۴

[2] بخاری، کتاب الادب، باب الحذر من الغضب الخ۔ مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب الخ

وجد اللہ تعالیٰ [1] فضیلت ہو جو وہ اس کی رضا اور خوشنودی کے لیے پیتا ہے۔

مطلب یہ کہ غصہ کا جو گھونٹ آدمی اللہ کی رضا کے لیے پیتا ہے وہ اس کے نزدیک سب سے قیمتی گھونٹ ہے۔ اس سے زیادہ کوئی گھونٹ اسے پسند نہیں ہے۔ غصہ کی حالت میں آدمی انجام سے بے پرواہ ہو کر کچھ بھی کر گزرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ خاموش رہنا پسند نہیں کرتا۔ یہ صحیح رویہ نہیں ہے۔ اگر معاملہ حق و باطل کا ہو تو غصے کا آنا یقینی ہے۔ محض اپنے غلط جذبہ اور نفس کی تسکین کے لیے غصے کا مظاہرہ غلط ہے۔ اس سے حالات کو ٹھیک کرنے میں مدد نہیں ملتی بلکہ وہ مزید خراب ہو سکتے ہیں، اس سے بچنا چاہیے۔

## شیریں کلامی

بعض اوقات زبان کے غلط استعمال سے حالات غلط رخ اختیار کر لیتے ہیں اور انھیں معمول پر لانا دشوار ہو جاتا ہے۔ شیریں کلامی حالات کو بگاڑ سے بچانے اور انھیں بہتر بنانے میں مدد دیتی ہے۔ اس کا مخاطب پر اچھا اثر پڑتا ہے اور وہ ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ بات سننے اور غور کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ اخلاق کا یہ اولین زینہ ہے۔ اسی کے بعد اس کی اعلیٰ منزلیں طے ہوتی ہیں بنو اسرائیل کو ہدایت کی گئی تھی۔

وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا [2] لوگوں سے بات اچھے طریقہ سے

أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ۔ (البقرہ: ۸۳) کرو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو.....

یہاں ایک بات قابلِ غور ہے۔ وہ یہ کہ نماز اور زکوٰۃ سے پہلے حسنِ کلام کا ذکر ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مخاطب سے اولین تعلق کلام ہی سے قائم ہوتا ہے۔ اس کے لیے بسا اوقات اس کی اہمیت نماز اور زکوٰۃ سے زیادہ ہوتی ہے۔ وہ بولنے والے کی نماز اور زکوٰۃ اور دین داری کو نہیں دیکھتا، بلکہ اس

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب الغضب والکبر۔ بحوالہ احمد

کے طرزِ گفتگو اور اندازِ تخاطب کو دیکھتا ہے، اس لیے حکم ہوا کہ لوگوں سے شائستہ لب ولہجہ میں بات کرو۔

قرآن مجید نے ' قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا ' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس میں مبالغہ پایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری بات انتہائی حسین اور سراسر جمال ہو۔ اس کا ایک ایک لفظ حسن وجمال میں ڈوبا ہوا ہو[1]

حسنِ کلام میں یہ بات بھی شامل ہے کہ آدمی حق بات کہے، عدل وانصاف کی بات کہے، اخلاق کی تعلیم دے۔ اللہ تعالیٰ کے دین کا تعارف کرائے، اس کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہیں انھیں دور کرے، اسے قبول کرنے کی دعوت دے معاشرہ میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض انجام دے۔ اس سے سماج میں آدمی کا اعتبار قائم ہوتا ہے۔ وہ ایک متعین نظریہ کا حامل اور اصول پسند سمجھا جاتا ہے۔ اس کی باتوں کو آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جاتا۔

یہی تعلیم اسلام کے ماننے والوں کو ان الفاظ میں دی گئی۔

| | |
|---|---|
| وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ | میرے بندوں (مسلمانوں) سے |
| ھِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ | کہہ دو کہ وہی بات کہیں جو بہتر ہے۔ |
| یَنْزَغُ بَیْنَھُمْ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ | بے شک شیطان انسانوں کے درمیان |
| کَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ؕ | فساد پیدا کردیتا ہے۔ شیطان انسان |
| (بنی اسرائیل: ۵۳) | کا کھلا دشمن ہے۔ |

مطلب یہ کہ بات کا وہ انداز اختیار کیا جائے جو بہتر ہو، جو سب وشتم، بدزبانی، طنز وتعریض، سختی اور درشتی، ذاتیات پر حملے اور الزام واتہام جیسی خرابیوں سے پاک ہو، جس میں محبت ہو، مٹھاس اور شیرینی ہو، دل موہ لینے والا اسلوب ہو اور جس سے مخاطب نفرت اور دوری کی جگہ ایک طرح کی کشش محسوس کرے۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ غلط اندازِ تخاطب سے شیطان کو درآنے کا موقع مل جائے گا، وہ مخالب کے جذبات کو بھڑکائے گا، بات کو سمجھنے اور سمجھ میں آجانے تو قبول کرنے نہ دے گا۔ غرض

---

[1] زمخشری، الکشاف: ۱/۱۶۰- دارالکتب العلمیہ، لبنان ۱۹۹۵ء مع حاشیہ ابن المنیر

یہ کہ پورا ماحول خراب کرکے رکھ دے گا۔ شیطان کو اس کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ یہی کامیاب گفتگو ہے۔

یہ بات زیادہ تفصیل کے ساتھ دوسری جگہ بیان ہوئی ہے۔ ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ | نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی ہے۔ |
| وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي | دفاع کرو تم اس طریقہ سے جو بہتر ہو، تو |
| هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي | تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس شخص میں عداوت |
| بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ | ہے وہ گویا گہرا دوست ہو گیا ہے۔ یہ |
| كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۝ وَمَا | خوبی ان ہی لوگوں کو ملتی ہے جن میں |
| يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا | صبر و برداشت کا مادہ ہوتا ہے۔ اور |
| وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ | یہ ان ہی کو ملتی ہے جو بڑے نصیبے والے |
| وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ | ہیں۔ اگر (ایسے موقع پر) شیطان تمہیں |
| نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۖ إِنَّهُ هُوَ | ورغلانے لگے تو اللہ کی پناہ طلب کرو |
| السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ (حم السجدہ: ۳۴-۳۶) | بے شک وہ سننے اور جاننے والا ہے۔ |

ان آیات میں سے ہر آیت اور اس کا ایک ایک لفظ قابلِ غور ہے اور موجودہ حالات میں بہترین ہدایت اور راہنمائی فراہم کر رہا ہے۔ فرمایا وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ، مطلب یہ کہ نیکی اور بدی، کسی بھی ضابطۂ اخلاق اور قانون کے تحت، کسی بھی ہوش مند کی نظر میں اور کسی بھی حال میں برابر نہیں ہو سکتے۔ نیکی کو عزت و احترام سے دیکھا جائے گا۔ بدی اس سے محروم ہوگی اور ذلت و رسوائی اس کے حصے میں آئے گی۔ نیکی کے اثرات کچھ اور ہوں گے اور بدی کے نتائج کچھ اور۔ نیکی اپنے ساتھ خیر لائے گی اور بدی کے دامن میں شر و فساد ہوگا۔ نیکی کا انجام دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بدی کے انجام سے سراسر مختلف ہوگا، اس لیے نیکی کی راہ اختیار کرو اور بدی سے کنارہ کش رہو۔ مخالف اگر طنز و تعریض کر رہا ہے، بدگوئی، زبان درازی اور غلط بیانی سے کام لے رہا ہے، جھوٹے الزامات لگا رہا اور بدنام کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو بھی تمہارے لیے زیب نہیں دیتا کہ تم بھی وہی راستہ اختیار کرو جو اس نے کیا ہے۔ اس لیے کہ اس کے بعد تم میں اور اس میں

کوئی فرق نہیں رہے گا۔ تمہارا رویہ اخلاقی لحاظ سے تمہارے حریف سے بلند تر ہونا چاہیے۔ وہ ہے 'اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ' اس کا مطلب یہ ہے کہ غلط باتوں کی تردید اور اس کے جواب کا تمہیں حق ہے لیکن اپنا دفاع بھی کرو تو اس طریقہ سے کرو جو بہتر اور شائستہ تر ہو، جس کے بارے میں دشمن کا دل بھی اندر سے کہے کہ شریفانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ بہت جلد تمہارے سامنے آئے گا اور تم دیکھو گے فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ۔ جس شخص سے تمہاری عداوت چلی آرہی ہے اس کی عداوت ختم ہوگئی ہے۔ وہ تمہارا دوست ہی نہیں بلکہ گہرا دوست ہوگیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں مخالف کو بہتر طریقہ سے جواب دینے کی جو ہدایت کی گئی ہے اس پر عمل کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اگر وہ غصہ اور اشتعال کا مظاہرہ کرے تو صبر کیا جائے اور اگر وہ زیادتی کرے تو معاف کر دیا جائے۔ اگر وہ یہ طریقہ اختیار کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت کرے گا اور ان کا دشمن ان کے سامنے اس طرح جھک جائے گا گویا وہ بہت قریبی دوست ہے۔[1]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول موجودہ حالات میں مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اشتعال انگیزی کی کوشش کے باوجود اشتعال میں نہ آنا اور دشمنوں کے ساتھ عفو و درگزر سے کام لینا کامیابی کی کلید ہے اور چھوٹی چھوٹی بات پر برافروختہ ہونا اور صبر کا دامن چھوڑ بیٹھنا شکست و ناکامی کی علامت ہے۔

آگے ارشاد ہوا: وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ یعنی یہ اعلیٰ کردار اور یہ پاکیزہ روش وہی لوگ اختیار کر سکتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے صبر و ثبات کی دولت سے نوازا ہے، جو پہاڑ کی طرح اپنے موقف پر قائم رہیں اور جن کی نگاہیں اپنے مقصد اور نصب العین سے کبھی نہ ہٹیں۔ جن کی نگاہیں منزل پر ہوتی ہیں وہ راہ کے خس و خاشاک کا خیال نہیں کرتے، راستے کے کنکر پتھر اور روڑے ان کے عزم کو کم زور نہیں کرتے اور دشواریوں میں مسلسل اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ لیکن یہ عزم و ہمت اور حوصلہ خوش قسمت انسانوں اور بڑے نصیبے والوں ہی کو ملتا ہے۔

---

[1] رواہ البخاری تعلیقا (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الآداب باب الغضب والکبر)

اس سلسلہ کی آخری ہدایت یہ ہے کہ 'وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ' اس میں آگاہ کیا گیا ہے کہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ ساری کوشش کے باوجود شیطان تمہیں اکسانے لگے کہ اس قدر مخالفت ہو رہی ہے اور تم مہر بہ لب بیٹھے ہو، اتنی اشتعال انگیزی کے باوجود تم پر سکوت طاری ہے۔ تم بھی ترکی بہ ترکی جواب آخر کیوں نہیں دیتے۔ آخر یہ بزدلی اور دوں ہمتی کیوں ہے؟ ایسی صورت میں تم غلط ردعمل کا شکار ہو سکتے ہو۔ اس وقت تمہیں سمجھنا چاہیے کہ شیطان تمہیں اخلاقی پستی کی طرف لے جا رہا ہے۔ فوراً تمہیں اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور اس سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ تمہیں شیطان کے شر سے محفوظ رکھے۔ جو اللہ کو پکارے وہ اس کی ضرور سنتا ہے اور وہ ہر ایک کے دل سے باخبر ہے۔

## کبر و غرور سے اجتناب

کبر ایک ایسی اخلاقی خرابی ہے جو تعلقات کو برابر کی سطح پر رہنے نہیں دیتی اور بلندی اور پستی کے جھوٹے جذبات ابھارتی ہے۔ جب انسان اپنے آپ کو بڑا اور دوسرے کو چھوٹا تصور کرے گا تو اس کا رویہ اس کے ساتھ لازماً حقارت آمیز ہوگا، وہ اسے مساوی سلوک کا حق دار نہیں سمجھے گا اور اس کے حقوق پامال کرنے میں بھی اسے تامل نہ ہوگا۔ کبر کا مرض کسی فرد میں ہو تو وہ ایک یا چند افراد کے ساتھ حقارت اور عدم مساوات کا معاملہ کر سکتا ہے لیکن اگر کسی قوم میں یہ بیماری ہو تو دوسری قوموں کو وہ کم تر اور فروتر سمجھے گی۔ انہیں عزت و احترام کا مقام نہیں دے گی اور وہ اس کی چیرہ دستیوں کا نشانہ بنتی رہیں گی۔

کبر و غرور کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ مال و دولت کی فراوانی، علمی تفوق اور برتری، سیاسی و سماجی حیثیت، تہذیب اور کلچر، تاریخ اور روایات اور حکومت و اقتدار جیسے اسباب پندار اور نخوت پیدا کرتے ہیں۔ اسلام نے بڑی سختی سے نخوت سے منع کیا ہے اور اسے شیطانی جذبہ قرار دیا ہے۔

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں کی تھیں ان میں ایک نصیحت یہ تھی:

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّکَ لِلنَّاسِ — لوگوں سے اپنا رخ مت پھیر اور

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۝ (لقمان:۱۸)

زمین میں اترا کر مت چل۔ بے شک اللہ کسی شیخی کرنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

اس میں اس بات کی ہدایت ہے کہ اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھو، لوگوں سے بے رخی نہ برتو، یہ کبر کی علامت ہے۔ تہذیب، شرافت اور خوش خلقی کے ساتھ ان سے بات کرو، کسی کو حقیر اور کم تر سمجھ کر اسے خطاب نہ کرو۔ قرآن مجید نے 'ولا تُصَعِّر' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کا مصدر تصعیر ہے۔ اہل لغت نے لکھا ہے کہ 'تصعیر' اونٹ کی ایک بیماری کو کہا جاتا ہے، جس میں اس کی گردن ایک طرف جھک جاتی ہے۔ اور وہ دوسری طرف دیکھ نہیں پاتا اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تکبر کی وجہ سے تمہاری وہ کیفیت نہ ہو جائے جو اونٹ کے اندر بیماری کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے کہ پلٹ کر دیکھنا اور سیدھے منہ بات کرنا مشکل ہو جائے۔

تکبر اور نخوت کا اظہار انسان کی رفتار اور چال ڈھال سے بھی ہوتا ہے اس لیے فرمایا۔ 'وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا' یعنی تمہاری چال سے غرور نہ ٹپکے، متکبروں کی چال نہ معلوم ہو کہ زمین پر قدم رکھنا مشکل ہو رہا ہو، بلکہ شریف اور مہذب انسانوں کی طرح چلو، تمہارے چلنے پھرنے سے تواضع اور خاکساری کا اظہار ہو، یہ محسوس ہو کہ یہ ایک شریف اور با اخلاق انسان ہے، اس سے ہر شخص آسانی سے مل سکتا ہے، اس کے سامنے اپنی بات رکھ سکتا ہے، وہ ہماری بات سنے گا اور ہمارے دکھ درد میں شریک ہوگا۔ بے تکلف اس کی صحبت اختیار کی جا سکتی ہے۔ وہ ناگواری نہیں بلکہ خوشی محسوس کرے گا۔

ایک اور موقع پر غرور کی چال سے ان الفاظ میں منع کیا گیا ہے۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ۝ كُلُّ ذَٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوهًا: (بنی اسرائیل:۳۷،۳۸)

زمین میں اکڑ کر نہ چلو تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو، نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو ان امور میں سے ہر ایک کا برا پہلو تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔

انسان کی حیثیت ہی کیا ہے؟ ایک مشتِ خاک، ایک بلبلا پانی کا۔

پانچ چھ فٹ کا انسان فخر کرے تو کس بات پر کرے؟ کیا وہ ٹھوکر مار کر سینۂ زمین شق کر دے گا یا اکڑ کر اور سر اٹھا کر پہاڑوں کی بلندی کو پہونچ جائے گا، تو پھر کیوں وہ نخوت کا مظاہرہ کرتا ہے؟ کیوں نہیں فروتنی اور عاجزی اختیار کرتا۔ یہی حقیقت اس آیت میں سمجھائی گئی ہے۔

بہت سے لوگ زبان سے بھی شیخی بگھارتے ہیں اور ان کا رویہ بھی متکبرانہ ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف بہت سے وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی عاجزی، خاکساری اور ناتوانی کا اعلان کرتے نہیں تھکتے۔ لیکن ان کا پورا وجود گواہی دیتا ہے کہ وہ پندار میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں رویے غلط ہیں۔ اس سے انسان خدا کی رحمت سے دور اور خلقِ خدا کی محبت سے محروم ہو جاتا ہے۔


ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کی ایک اہم پیش کش

مولانا سید جلال الدین عمری کی کتاب

**اسلام اور مشکلاتِ حیات**

- اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے نافرمانوں پر مشکلات اور مصائب کیوں آتے ہیں؟
- اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو قومی اور اجتماعی، شخصی اور انفرادی مشکلات سے کیوں گزارا جاتا ہے؟
- امراض، جسمانی تکالیف، مالی مشکلات، حادثات اور صدمات میں ایک مومن کا کیا رویہ ہونا چاہیے؟
- مرض اور مشکلات حیات میں خودکشی کیوں ناجائز ہے؟
- مرض کی شدت میں کسی کی جان کیوں نہیں لی جاسکتی؟

یہ کتاب قرآن وحدیث کی روشنی میں ان سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے، مؤثر انداز بیان، دل نشیں بحث اور علمی اسلوب، آفسٹ کے حسین طباعت، خوب صورت سرورق۔ ضخامت ۸۸ صفحات۔ قیمت ۸/روپے

ملنے کا پتہ: مینجر مکتبہ تحقیق وتصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

## تحقیق وتنقید

# شاہ ولی اللہؒ اور مولانا ابوالکلامؒ آزاد کی تفسیروں کا تقابلی مطالعہ

ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ م ۱۷۶۲ء مطابق ۱۱۷۶ھ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ م ۱۹۵۸ء دونوں کا شمار ہندوستان کے ممتاز علماء اور صاحبِ طرز مصنفوں میں ہوتا ہے۔ ان دونوں حضرات نے علم وفن کے بہت سے موضوعات کو اپنے قلم سے آراستہ کیا ہے اور اپنی تحقیقات وتوجیہات اور طرزِ ادا کا نقش مرتسم کیا ہے۔ دونوں حضرات نے فہم قرآن کو اپنی خصوصی دلچسپی اور مخصوص شغف کا موضوع قرار دیا ہے۔

شاہ ولی اللہ کو مولانا آزاد پر زمانی تقدم ہی حاصل نہیں ہے بلکہ بہت سی علمی بازیافت اور فکری نکات میں شاہ صاحب کو مولانا آزاد کا پیش رو اور رہنما ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔ مولانا آزاد نے اس بات کا فراخ دلانہ اعتراف بھی کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تصانیف اور افکار وآثار کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اور ان کی شخصیت اور کارناموں کا اثر قبول کیا تھا۔ اس کا اظہار انھوں نے اپنی تحریروں میں جابجا کیا ہے۔ مثلاً شاہ صاحب کی شخصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

> "بایں ہمہ معلوم ہے کہ وہ جو دورِ آخر کے فاتح اور سلطانِ عصر ہونے کا مقام تھا اور قطبِ وقت وہ صرف حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہؒ ہی کے لیے تھا اور لوگ بھی بے کار نہ رہے، کام کرتے رہے مگر جو کام یہاں انجام پایا وہ صرف انھیں کے لیے تھا۔"[1]

اسی طرح شاہ صاحب کی تصانیف کی قدر و قیمت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ائمہ متاخرین میں حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ و اصحابہ کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ کی تنقیحات و تعقبات اس باب میں نہایت محققانہ و انفع و ارفع ہوتی ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ میں گو اشارات و اجمال (ولکن ابلغ من التصریح) سے کام لیتے ہیں لیکن تفہیمات الٰہیہ اور خیر کثیر اور البدور البازغہ میں بالکل پردہ اٹھا دیا ہے۔"[۲]

مولانا ابوالکلام آزاد پر حضرت شاہ ولی اللہ کی تصنیفات و افکار کا، بالخصوص ان کے قرآنی فکر اور تحریکِ فہمِ قرآن کا جو اثر تھا، اس نے مولانا آزاد کے قرآنی ذوق کو تابندہ کیا۔ شاہ صاحب نے جس طرح امتِ مسلمہ ہند کو فہمِ قرآن کی دعوت دی اور قرآن کو دستورِ حیات بنانے پر زور دیا ٹھیک اسی طرح مولانا آزاد نے بھی از سرِ نو امتِ مسلمہ کو قرآن فہمی کی دعوت دی اور قرآن کو اصلاح و انقلابِ احوال کا ذریعہ بنانے پر آمادہ کیا۔ گویا یہ تحریک ان کو شاہ صاحب سے ملی۔ چنانچہ مولانا آزاد نے اخبار البلاغ ۲۶ نومبر ۱۹۱۵ء کے سرورق پر ترجمان القرآن کا جو اشتہار دیا تھا اس میں لکھا تھا کہ:

"شاہ ولی اللہ نے دو سو برس پہلے فارسی ترجمہ کیا پھر شاہ رفیع الدین اور شاہ علامہ عبدالقادر نے اردو ترجمے کیے اب اس بنیاد کی تکمیل کا شرف خدا نے ایڈیٹر الہلال کو دیا ہے ترجمان القرآن اردو بحمداللہ لیتھو میں زیر طبع ہے۔"[۳]

شاہ ولی اللہ نے اصولِ تفسیر پر ایک مختصر مگر جامع کتاب الفوز الکبیر فی اصول التفسیر لکھی نیز قرآن کریم کا سلیس بامحاورہ فارسی زبان میں ترجمہ کیا جس کا نام انھوں نے فتح الرحمٰن رکھا۔ شاہ صاحب نے قرآن سے عوام کا ذوق اور تعلق پیدا کرنے کے لیے صرف ترجمہ کو کافی سمجھا، البتہ کہیں کہیں مختصر حواشی لکھے۔ طویل اور مفصل تشریح سے گریز کیا۔ تاکہ لوگوں کو اپنی تفسیر و تشریح کا اسیر بنانے کے بجائے خود کلام اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

"یہ زمانہ جس میں ہم موجود ہیں اور یہ ملک جس کے ہم باشندے

ہیں اس میں مسلمانوں کی خیر خواہی تقاضا کرتی ہے کہ روزمرہ کی متداول اور سلیس فارسی زبان میں اظہارِ فضیلت اور عبارت آرائی متعلقہ قصوں اور توجیہات کا تذکرہ کیے بغیر قرآن عظیم کا ترجمہ کیا جائے تاکہ عوام و خواص یکساں طور پر سمجھ سکیں اور چھوٹے بڑے سبھی معانی قرآن کا ادراک کر سکیں، اس لیے اس اہم کام کا داعیہ فقیر کے دل میں ڈالا گیا اور اس کے لیے مجبور کیا گیا۔"[۴]

تقریباً یہی نہج مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اختیار کیا انھوں نے قرآن کے ترجمہ کے ساتھ کہیں کہیں ضروری اشارات ضبطِ قلم کیے۔ مگر شاہ ولی اللہ کی طرح وہ اس طریقہ کار کے پابند نہ رہ سکے اور جوں جوں آگے بڑھتے گئے ان کا قلبی انشراح بڑھتا گیا، خیالات امنڈتے گئے اور قلم زور پکڑتا چلا گیا۔ چنانچہ سورۂ فاتحہ کے علاوہ دیگر ابتدائی سورتوں میں تو انھوں نے مختصر حواشی اور نوٹس پر اکتفا کیا مگر بعد کی سورتوں مثلاً سورۂ ہود، یوسف، النحل، بنی اسرائیل، کہف، مریم، طٰہٰ، انبیاء وغیرہ میں انھوں نے مفصل تفسیری کلام کیا۔ مولانا آزاد نے یوں تو ایک ساتھ مقدمۂ تفسیر، ترجمان القرآن اور تفسیر البیان تینوں کا ارادہ اور اعلان کیا جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

"۱۹۱۵ء میں جب میں نے اس کام کا ارادہ کیا تو بیک وقت تین چیزیں پیش نظر تھیں ترجمہ، تفسیر اور مقدمۂ تفسیر۔ میں نے خیال کیا تھا کہ یہ تین کتابیں قرآن کے فہم و مطالعہ کی تین مختلف ضرورتیں پوری کر دیں گی، عام تعلیم کے لیے ترجمہ، مطالعہ کے لیے تفسیر، اہلِ علم و نظر کے لیے مقدمہ۔"[۵]

مگر وہ ترجمان القرآن ہی اردو دنیا کو دے سکے، وہ بھی زمانہ کی چیرہ دستی کے باعث صرف اٹھارہ پاروں تک ہی شائع ہو سکی۔ ترجمان القرآن میں ترجمہ کے علاوہ جا بجا حواشی ہیں اور سورتوں کے آخر میں مفصل نوٹس موجود ہیں۔ مگر ان سب میں اصل توجہ ترجمہ پر دی گئی ہے اور یہ ترجمہ بھی ترجمہ نہیں، بلکہ آزاد ترجمانی ہے مولانا آزاد اس کی بابت لکھتے ہیں:

"ترجمان القرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے

کہ اس کی تمام خصوصیات کا اصل محل اس کا ترجمہ اور ترجمہ کا اسلوب ہے، اگر اس پر نظر رہے گی تو پوری کتاب پر نظر رہے گی، وہ اوجھل ہوگی تو پوری کتاب اوجھل ہوگی۔

قرآن کے مطالب و مقاصد کے اصول و معارف کے جس قدر احوال و مبادیات از سرِ نو مدون کیے گئے ہیں وہ سب کے سب اسی محل میں ڈھونڈے جا سکتے ہیں اور یہی خزینہ ہے جس میں کتاب کی خصوصیات مدفون ہیں"۔[۶]

شاہ ولی اللہ اور مولانا ابوالکلام آزاد کے تفسیری خیالات میں اخذ و استفادہ، ہم آہنگی، اختلاف، تنقید اور امتیاز کے کئی پہلو ہیں۔ کہیں شاہ صاحب کے خیالات سے مولانا آزاد استفادہ کرتے ہیں، کہیں اختلاف کرتے ہیں اور کہیں تنقید کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ یہاں استفادہ، مماثلت، اختلاف اور تنقید و امتیاز کے بعض پہلوؤں پر گفتگو کی جائے گی۔

## قرآن فہمی میں الجھاؤ کے اسباب

شاہ ولی اللہ نے الفوز الکبیر کے دوسرے باب میں نظمِ قرآن کے مخفی ہو جانے کے وجوہ اور ان کے علاج کے بارے میں بحث کی ہے، شاہ صاحب کا خیال ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت قرآن کا سمجھنا بالکل آسان تھا کیوں کہ قرآن عربوں کی سادہ زبان اور اسلوب کے مطابق ہی نازل ہوتا تھا، مگر جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اس پر حجاب پڑتا گیا۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ:

"قرآن مجید ٹھیک ٹھیک بلا کسی تفاوت کے محاورۂ عرب کے موافق نازل ہوا اور اہلِ عرب اپنی زبان کے سمجھنے میں جو سلیقہ رکھتے تھے اس سے قرآن مجید کے معنیٔ منطوق کو سمجھ لیتے تھے ..... صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں سوالات کم پیش کرتے تھے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کم ہی سوالات منقول ہیں لیکن جب اس طبقہ کا دور گذر چکا، علوم تفسیر میں عجمیوں نے دخل دینا

شروع کیا اور وہ پہلی زبان بھی متروک ہوگئی تو اس وقت بعض مقامات پر شارع کی مراد سمجھنے میں دشواری پیدا ہوئی اور ضرورت پڑی کہ لغت اور علم نحو کی چھان بین کی جائے تو سوالات وجواب کا سلسلہ شروع ہوا اور تفسیر کی کتابیں لکھی جانے لگیں۔[۴]

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس خیال کو اپنے مقدمۂ ترجمان القرآن میں جسے مقدمۂ تفسیر سمجھنا چاہیے، مرکزی حیثیت دی ہے اور اپنے مخصوص پیرایۂ بیان اور زورِ کلام سے قوت اور نئی جہت عطا کی ہے۔ نیز اسے مفسرین کے زوالِ فکر اور کوتاہ بینی کا آئینہ بنا دیا ہے۔

مولانا لکھتے ہیں:

"قرآن جب نازل ہوا تو اس کے مخاطبوں کا پہلا گروہ بھی ایسا ہی تھا، تمدن کے وضعی اور صناعی سانچوں میں ابھی اس کا دماغ نہیں ڈھلا تھا، فطرت کی سیدھی سادی فکری حالت پر قانع تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن اپنی شکل ومعنی میں جیسا کہ واقع ہوا تھا، ٹھیک ویسا ہی اس کے دلوں میں اتر گیا اور اسے قرآن کے فہم ومعرفت میں کسی طرح کی دشواری محسوس نہ ہوئی۔ صحابہ کرام پہلی مرتبہ قرآن کی کوئی آیت یا سورت سنتے تھے اور سنتے ہی اس کی حقیقت پا لیتے تھے۔

لیکن صدرِ اول کا دور ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ روم وایران کے تمدن کی ہوائیں چلنے لگیں اور پھر یونانی علوم کے تراجم نے علوم و فنون وضعیہ کا دور شروع کر دیا، نتیجہ یہ نکلا کہ جوں جوں وضعیت کا ذوق بڑھتا گیا قرآن کے فطری اسلوبوں سے طبیعتیں نا آشنا ہوتی چلی گئیں، رفتہ رفتہ وہ وقت آگیا کہ قرآن کی ہر بات وضعی اور صناعی طریقوں کے سانچہ میں ڈھالی جانے لگی۔"[۵]

مولانا آزاد نے دوسری جگہ لکھا ہے:

"قرآن کے صحتِ فہم کے لیے عربی لغت وادب کا صحیح ذوق شرطِ اول ہے لیکن مختلف اسباب سے جن کی تشریح محتاجِ تفصیل

ہے یہ ذوق کم پڑتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ وقت آگیا جب مطلب میں بے شمار الجھاؤ محض اس لیے پڑ گئے کہ عربیت کا ذوقِ سلیم باقی نہیں رہا اور جس زبان میں قرآن نازل ہوا تھا اس کے محاورات و مدلولات سے یک قلم بُعد ہو گیا"[۹]

## وضعی اصطلاحات

قرآن کریم اور اس کے علوم و معارف کو سمجھنے کے لیے بعد کے علماء اور مفسرین نے اصطلاحیں وضع کیں، وہ اصطلاحات قرآن کی پابند ہیں نہ کہ قرآن ان اصطلاحات کا پابند ہے، اس نکتہ کو بھول جانے کی وجہ سے مفسرین سے بڑی لغزشیں ہوئی ہیں، شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے جب چاہا کہ آدمیوں سے ہم کلام ہو تو اس نے صرف اس اصلِ بسیط کو اپنے کلام میں منضبط فرمایا نہ کہ ان قوانین کو جو زمانہ اور مذاق کے بدل جانے پر ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ درحقیقت اصطلاحی قوانین کی پابندی عجز اور جہل کی دلیل ہے"[۱۰]

مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اس خیال سے اتفاق کیا ہے اور نہ صرف اتفاق کیا ہے بلکہ اسے قرآن فہمی کے اولین اصولوں میں قرار دیا ہے، جس کو ذہن نشین کرنا قرآن کے طالب علم کے لیے ازحد ضروری ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"نزولِ قرآن کا موضوع فلسفۂ یونانی نہیں ہے اور نہ نزولِ قرآن کے وقت عربی زبان ان مصطلحات سے آشنا ہوئی تھی، پس جہاں کہیں قرآن میں وہ الفاظ آئے ہیں ان کے معانی وہ نہیں ہو سکتے جو وضعِ مصطلحات کے بعد قرار پائے، لیکن اب ان کے وہی مفہوم لیے جانے لگے اور اس کی بنا پر طرح طرح کی دور از کار بحثیں پیدا کر دی گئیں"[۱۱]

## قرآن کی فصاحت و بلاغت

قرآن کی فصاحت و بلاغت ایک عظیم لسانی و ادبی شاہکار ہے اس کو سمجھنے

کے لیے علم معانی و بیان کی رہنمائی کام آتی ہے مگر یاد رہے کہ ہر فن کے اپنے وضعی ضابطے ہوتے ہیں، ان سے تفہیم قرآن میں مدد تو لی جاسکتی ہے مگر قرآن کو اس سانچے میں ڈھالا نہیں جاسکتا۔ شاہ ولی اللہ اس نکتہ کو یوں واضح کرتے ہیں۔

"علم معانی و بیان ایک ایسا علم ہے جو کہ حضرات صحابہؓ و تابعینؒ کے زمانہ کے بعد پیدا ہوا ہے، اس وجہ سے اس کے جو مسائل جمہور عرب کے عرف کے مطابق سمجھ میں آئیں وہ سر آنکھوں پر اور جو ایسے دقیق امور ہوں کہ ان فنون میں گہری معلومات رکھنے والے کے سوا کسی اور کی سمجھ میں نہیں آتے تو ہمیں تسلیم نہیں کہ وہ کلام اللہ میں بھی مطلوب ہیں۔"[۱۲]

مولانا آزاد فہم قرآن کے اسی اصول کو اپنے مخصوص لب و لہجہ میں یوں بیان فرماتے ہیں:

"قرآن کی بلاغت کا مسئلہ ہمارے وجدان کے لیے اس قدر سہل مگر ہمارے دماغ کے لیے اس قدر دشوار کیوں ہو رہا ہے؟ صرف اسی لیے کہ وضعیت کا خود ساختہ ترازو ہمارے ہاتھ میں ہے، ہم چاہتے ہیں اسی سے قرآن کی بلاغت بھی وزن کریں۔"[۱۳]

## اسلوبِ قرآن

عام کتابوں سے ہٹ کر قرآن کریم کا اپنا ایک منفرد اسلوب ہے، اس اسلوب کو فراموش کرنے کی وجہ سے قرآن فہمی کا معاملہ الجھ جاتا ہے۔ یہ اسلوب کیا ہے؟ شاہ صاحب اور مولانا آزاد دونوں اس پر کھل کر گفتگو کرتے ہیں، شاہ صاحب کا فکری اثر مولانا آزاد کے یہاں بھی ملتا ہے، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"قرآن مجید میں ان علوم کا بیان قدیم عربوں کی روش پر ہوا ہے، متاخرین کا اسلوب اختیار نہیں کیا گیا، آیت احکام میں متن نویسوں کی طرح اختصار اور اصولیین کی طرح غیر ضروری قید کی تنقیح کا التزام نہیں کیا گیا۔ علم مباحثہ کی آیات میں مشہور و مسلّم اقوال اور نفع بخش خطاب کا التزام کیا گیا ہے۔ دلائل کی ترتیب میں

منطقیوں کے اسلوب کی پیروی اور ایک مضمون کے بعد دوسرے مضمون کے شروع کرنے میں ادبار متاخرین کی طرح مناسبت کی پیروی نہیں کی گئی۔[۱۴]

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"اس کو (محکم کو) سمجھنے میں اعتبار پہلے عربوں کا ہے نہ کہ ہمارے زمانے کے بال کی کھال نکالنے والوں کا، جن کی موشگافی ایسا سخت ترین مرض ہے کہ جس کے ذریعہ سے وہ محکم کو مجہول بنا دیتے ہیں"[۱۵]

یہی رنگ و آہنگ مولانا ابوالکلام آزاد کے یہاں بھی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"قرآن کا استدلال کیوں نمایاں نہیں ہوتا، اس کے تمام تر دلائل و براہین جنھیں وہ حجۃ بالغہ سے تعبیر کرتا ہے، کیوں مستور ہو گئے ہیں؟ اس لیے کہ وضعیت کے استغراق نے منطق کا سانچہ ہمیں دے دیا ہے ہم چاہتے ہیں کہ قرآن کے دلائل و براہین بھی اسی میں ڈھالیں"[۱۶]

ایک دوسری جگہ رقم طراز ہیں:

"ہمارے مفسروں کو فلسفہ و منطق کے انہماک نے اس قابل ہی نہ رکھا کہ کسی حقیقت کو اس کی سیدھی سادی شکل میں دیکھیں اور قبول کریں، انھوں نے انبیاء کرام کے لیے بڑی فضیلت اس میں سمجھی کہ انھیں منطقی بنا دیں اور قرآن کی ساری عظمت اس میں نظر آئی کہ اس کی ہر بات ارسطو کی منطق کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی نکلے"[۱۷]

## تفسیرِ سلف کا اعتبار

اصولِ تفسیر میں ایک بنیادی مسئلہ متقدمین اور متاخرین مفسروں کے منہجِ تفسیر میں بُعد اور فاصلہ کا ہے، ایسے مواقع پر یقیناً صحابہ و تابعین اور سلف صالحین کے طریقہ کو اہمیت اور ترجیح حاصل ہوگی۔ اس نکتہ کو شاہ ولی اللہ نے یوں واضح کیا ہے۔

"حضرات صحابہ اور تابعین کبھی لفظ کی تفسیر اس کے معنیٰ لازمی سے کرتے ہیں اور متاخرین لغات کے تتبع اور مواقعِ استعمال کے

تفحص کی بنا پر اس قدیم تفسیر میں شبہات کرتے ہیں۔ اس رسالہ میں ہماری غرض صرف تفسیر سلف کا کامل اتباع" ہے۔ [۱۸]

ایک دوسری جگہ اس بات کی مزید وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

"لغتِ قرآنی کو عربِ اول کے استعمال کے مطابق لینا چاہیے اور صحابہؓ و تابعینؒ کے آثار پر پورا اعتماد کرنا چاہیے۔" [۱۹]

مولانا ابوالکلام آزاد اصولِ تفسیر کے اس کلیہ سے نہ صرف استفادہ کرتے ہیں، بلکہ اس کی اہمیت پر زور دیتے ہیں اور ان لوگوں پر تنقید کرتے ہیں جو سلف کی صریح تفسیر کے خلاف قدم اٹھاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ:

"اس بات کا اندازہ کرنے کے لیے قرآن کا کوئی ایک مقام لے لو، پہلے اس کی تفسیر صحابہؓ و تابعین کی روایات میں ڈھونڈو، پھر بعد کے مفسروں کی طرف رخ کرو اور دونوں کا مقابلہ کرو، صاف نظر آجائے گا کہ صحابہ و سلف کی تفسیر میں معاملہ بالکل واضح تھا۔ بعد کی بے محل دقیقہ سنجیوں نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا اور الجھاؤ پیدا ہو گئے۔" [۲۰]

## ترجمہ میں یکسانیت

شاہ ولی اللہ کا ترجمہ فتح الرحمٰن اور مولانا آزاد کا ترجمان القرآن دونوں کا مطالعہ اور مقابلہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ بعض جگہ دونوں تراجم میں ہم آہنگی موجود ہے، دوسرے لفظوں میں مولانا آزاد کا ترجمہ شاہ صاحب کے ترجمہ پر مبنی ہے مثلاً۔

سورۂ البقرہ کی آیت ہے وَإِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ (البقرہ: ۲۰۵)

مولانا آزاد نے اس کا ترجمہ کیا ہے، "جب انھیں حکومت مل جاتی ہے تو ان کی تمام سرگرمیاں ملک میں اس لیے ہوتی ہیں تاکہ خرابی پھیلائیں اور انسان کی زراعت اور محنت کے نتیجوں کو اور اس کی نسل کو ہلاک کریں۔" [۲۱]

یہاں "تولّٰی" کا ترجمہ حکومت کیا گیا ہے، جب کہ عام طور پر مفسرین نے واپس جانے اور پھرنے کے معنی مراد لیے ہیں۔ مولانا آزاد کا یہ ترجمہ نہایت معنی خیز ہے اور

منشا کلام کو بلند کر دیتا ہے۔ اس ترجمہ میں مولانا آزاد کے پیش رو شاہ ولی اللہ ہیں جنھوں نے اس معنویت کو تلاش کیا ہے۔ ان کا ترجمہ ہے :

"چوں ریاست پیدا کند بشتابد در زمین تا تباہی کند در آں و نابود سازد زراعت و مواشی را" [۲۳]

اسی طرح سورۃ الانعام میں اسی لفظ پر مشتمل ایک دوسری آیت ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (انعام: ۱۲۹)

مولانا آزاد نے ترجمہ کیا ہے "اور دیکھو ہم اس طرح بعض ظالموں کو بعض ظالموں پر مسلط کر دیتے ہیں ان کی اس کمائی کی وجہ سے جو وہ اپنی بداعمالیوں سے حاصل کرتے ہیں" [۲۴]

مفسرین کا عام رجحان یہ ہے کہ یہ اشارہ قیامت کی طرف ہے جبکہ مولانا آزاد نے دنیا میں ظالموں کے لیے مکافاتِ عمل کا ایک ضابطہ قرار دیا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کا بھی رجحان اسی طرف ہے۔ چنانچہ ان کا ترجمہ ہے :

"وہم چنیں مسلط می کنیم بعض ستم کاراں را بر بعض بشامت آنچہ می کنند" [۲۵]

سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ (بنی اسرائیل-۸۴)

شاکلہ کا مطلب عام طور پر مفسرین نے فطرت و جبلت بیان کیا ہے جو سیاق و سباق سے زیادہ ہم آہنگ نہیں معلوم ہوتا۔ مولانا آزاد نے اس کا ترجمہ کیا ہے "کہہ دو ہر انسان اپنے طور طریقہ کے مطابق عمل کرتا ہے" [۲۶]

مولانا آزاد کا ترجمہ لغت اور زبان کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہے اس سلسلہ میں مولانا آزاد کے پیش رو شاہ ولی اللہ ہیں جنھوں نے شاکلہ کا ترجمہ جبلت کے بجائے "روش" یعنی طور طریقہ کیا ہے :

"بگو ہر کس عمل می کند بہ روش خود" [۲۷]

اسی طرح سورہ المومنون میں ہے ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ (المومنون : ۳۱)

عام طور پر مترجمین نے "قرنا" کا ترجمہ "اقوام" کیا ہے۔ مگر قرن اور قوم میں جو فرق ہے وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں۔ شاہ صاحب نے قرن کا ترجمہ قرن ہی کیا ہے۔

"باز بیافریدیم بعد ایشاں قرنے دیگر را" [۲۸]

مولانا آزاد نے اسی نکتہ کو پکڑا ہے اور ترجمہ اس طرح کیا ہے "پھر ہم نے قوم نوح کے بعد قوموں کا ایک دوسرا دور پیدا کر دیا"۔[۲۸]

## تفسیر میں یکسانیت

ترجمہ کے علاوہ آیات کی تفسیر اور تشریح حواشی میں بھی ہم آہنگی یا اخذ و استفادہ کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ نمونہ کے بعض مقامات ملاحظہ ہوں۔

**نیکی میں تعاون کرو۔**

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ .... وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ-۲) مفسرین نے عام طور پر اس آیت کو منسوخ مانا ہے کیوں کہ اس میں حرمت کے مہینوں یعنی ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب میں جنگ کی ممانعت ہے بعد میں اباحت نازل ہوئی۔ شاہ صاحب نے مفسرین کے اس خیال سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ:

"یہ آیت آخری عہد کی آیات میں سے ہے، اس لیے اس کو منسوخ سمجھنا جیسا کہ مفسرین سمجھتے ہیں درست نہیں"۔[۲۹]

شاہ صاحب نے اس کی مزید وضاحت الفوز الکبیر میں کی ہے جہاں انھوں نے ناسخ و منسوخ کی بحث کی ہے۔[۳۰]

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس سلسلہ میں شاہ صاحب کا موقف اختیار کیا۔ بلکہ نسخ آیات کے سلسلہ میں انھوں نے شاہ ولی اللہ ہی پر اعتماد کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

"کتاب و سنت کی منسوخات بہت قلیل اور گنی ہوئی ہیں۔ قرآن کی منسوخ آیتیں (مصطلح متاخرین) گھٹتے گھٹتے اتقان میں بیس تک پہنچیں اور فوز الکبیر میں پانچ تک"۔[۳۱]

مولانا آزاد نے نہ صرف اس آیت کو محکم تسلیم کیا ہے بلکہ اس سے قاعدۂ کلیہ بھی برآمد کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اس آیت میں جو قاعدہ بیان کیا گیا ہے وہ مسلمانوں کے تمام کاموں کے لیے ایک عام دستور العمل ہے، جو کوئی نیک کام کرے اس کی مدد

کرو اگرچہ مسلمان نہ ہو، اور اگرچہ مخالف ہو، جو کوئی برائی کرے اس کی مدد نہ کرو، اگرچہ مسلمان ہو اور اگرچہ تمہارا ساتھی ہو"۔ [۳۲]

## اعتبار ایمان وعمل کا ہے

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَ الصَّابِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (البقرہ: ۶۲)

شاہ صاحب اس آیت کی تشریح کرتے ہیں:

"آیت کے معنیٰ کا حاصل یہ ہے کہ آدمی جس فرقہ کا بھی ہو جب ایمان لائے گا تو اہلِ نجات ہوگا، خصوصیتِ فرقہ کا اعتبار نہیں ہے"۔ [۳۳]

مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی یہی تشریح کی ہے۔

"اس اصلِ عظیم کا اعلان کہ سعادت و نجات ایمان وعمل سے وابستہ ہے، نسل وخاندان یا مذہبی گروہ بندی کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے"۔ [۳۴]

## دین میں جبر نہیں

لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (البقرہ: ۲۵۶)

شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ "حجتِ اسلام ظاہر ہو چکی۔ پس گویا جبر نہیں کیا جائے گا اگرچہ فی الجملہ جبر ہوگا" [۳۵]

شاہ صاحب نے "فی الجملہ جبر باشد" کا اضافہ اس لیے کیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ 'امر بالمعروف' کے لیے جبر نہیں ہے مگر 'عن المنکر' کے لیے جبر تو ممکن ہے، مولانا آزاد نے اپنے خاص اسلوب میں اس کو یوں بیان کیا ہے:

"اس اصلِ عظیم کا اعلان کہ دین واعتقاد کے معاملہ میں کسی طرح کا جبر واستکراہ جائز نہیں۔ احکام جہاد کے بعد ہی یہ ذکر اس لیے کیا گیا تاکہ واضح ہو جائے کہ جنگ کی اجازت ظلم وتشدد کے انسداد کے لیے دی گئی ہے نہ کہ دین کی اشاعت کے لیے"۔ [۳۶]

مولانا آزاد نے مذہبی آزادی پر تفصیلی بحث سورۂ یونس کی آیت نمبر ۱۰۸ وَمَا

اَنَا عَلَیکُم بِوَکِیلٍ کی تشریح میں کی ہے یہ بحث بلاشبہ بصیرت افروز اور لائقِ استفادہ ہے۔

## تذکیر بایام اللہ

شاہ ولی اللہ نے الفوز الکبیر میں قرآن کریم کے بیان کردہ صریح علوم کو پانچ عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے، ان میں چوتھی قسم علم تذکیر بایام اللہ ہے، گزشتہ انبیاء اور ان کی قوموں کے واقعات کو جو قرآن میں وارد ہوئے "ایام اللہ" کے تحت بیان کیا ہے۔ شاہ صاحب نے یہ اصطلاح قرآن کی بات وَذَکِّرھُم بِاَیّامِ اللہِ (ابراہیم:۵) سے اخذ کی ہے، اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ:

> "ایام اللہ یعنی وہ واقعات جن کو اللہ تعالیٰ نے ایجاد فرمایا ہے مثلاً فرماں برداروں کے لیے انعام اور نافرمانوں کے لیے عذاب، ان میں سے ایسی جزئیات کو اختیار فرمایا کہ جو پیشتر سے ان کے کان میں پڑ چکی تھیں اور وہ اجمالی طریقہ سے ان کا ذکر سن چکے تھے مثلاً قوم نوح و عاد و ثمود کے قصے جن کو عرب اپنے باپ دادا سے مسلسل سنتے آئے اور حضرت ابراہیمؑ اور انبیاء بنی اسرائیل کی مختلف داستانیں جن سے یہود اور عرب کے زمانہ دراز کے اختلاط کے باعث ان کے کان آشنا تھے۔"[۳۷]

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں امم سابقہ اور انبیاء سابقین کے تذکرہ کے موقع پر یہی اصطلاح استعمال کی ہے اور اسے شاہ صاحب کی طرح بطور اصول اور کلیہ کے پیش کیا ہے لکھتے ہیں:

> "عربی میں ایسے واقعات کو جو بڑے اہم اور فیصلہ کن ہوتے ہیں اور قومی روایت کی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں یوں تعبیر کیا جاتا ہے کہ فلاں واقعہ کا دن مثلاً یوم بدر، یوم احد، یوم قادسیہ اور اسی سے قومی معرکوں کے ایام کی تعبیر پیدا ہوگئی ہے چونکہ فیصلۂ نتائج کے یہ دن جو تمام قوموں کو پیش آئے اللہ کے قانونِ حق کے نفاذ کے دن تھے اور حق و باطل کی معرکہ آرائی تھی اس لیے قرآن نے انھیں ایام اللہ سے تعبیر کیا ہے۔"[۳۸]

## امتِ واحدہ

اللہ تعالیٰ نے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء: ۹۲) یہ تمہاری امت ایک امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں تو میری ہی عبادت کرو۔

شاہ ولی اللہ نے اس ضمن میں ایک کلیہ بیان کیا ہے "یعنی اصلِ دین واحد است، اختلاف در فروع می باشد"[۳۹] اصل دین تو ایک ہے اور اختلاف فروع میں ہے۔

مولانا آزاد نے اس کلیہ کو بڑے خوبصورت پیرایہ میں بیان کیا ہے اور اس آیت سے توحیدِ امت، توحیدِ ربوبیت اور توحیدِ عبادت کا استنباط کیا ہے مولانا لکھتے ہیں :۔

> "آیت اس تمام تذکرہ کا خلاصہ ہے جو انبیاء کرام کا اوپر گذر چکا ہے، یعنی اللہ کے یہ تمام رسول جو مختلف عہدوں اور قوموں میں ظاہر ہوئے ان سب کی دعوت کا ماحصل کیا تھا؟ انھوں نے نسلِ انسانی کے مختلف عہدوں اور گروہوں کو کس بات کا پیغام پہونچایا؟ وہ بات ایک ہی تھی یا ایک سے زیادہ؟ یہ آیت اپنے پہلے لفظوں میں جواب دیتی ہے کہ ان سب کا پیام ایک ہی تھا اور وہ یہی تھا کہ تم سب ایک ہی امت ہو، تم سب کا پروردگار ایک ہی پروردگار ہے، پس الگ الگ نہ ہو، اسی کی بندگی کرو"۔[۴۰]

## شریعتوں کا اختلاف زمانے کی وجہ سے

شریعتوں کے اختلاف سے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے : لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ ... اللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝ (الحج: ۶۷-۶۹)

شاہ صاحب نے ان آیات کی تشریح میں لکھا ہے کہ :

> "آیت میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ شریعتوں کا اختلاف زمانوں کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ ساری شریعتیں حق ہیں اور اپنے زمانہ میں معمول بہا تھیں تو درحقیقت ان میں جھگڑا نہیں کرنا چاہئے"۔[۴۱]

مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اس نکتہ کو ابھارا ہے وہ کہتے ہیں۔

"آیت میں اس اصل عظیم کی طرف اشارہ ہے کہ اصلِ دین ایک ہے البتہ مناسک یعنی عبادت کے طور طریقے میں اختلاف ہوا کیوں کہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی جس کی جیسی حالت تھی اس کے مطابق ایک طور طریقہ دے دیا گیا پس طالب حق کو چاہیے کہ سب سے پہلے اصل کو دیکھئے نہ یہ کہ فرع کے پیچھے پڑ جائے"۔[۴۲]

## میثاق النبیین

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ (آل عمران: ۸۱)

اس آیت کا ترجمہ مولانا آزاد نے اس طرح کیا ہے۔

"اور دیکھو جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے نبیوں کے بارے میں (نبی اسرائیل سے) عہد لیا تھا کہ ہم نے تمہیں کتاب و حکمت عطا فرمائی ہے، پھر اگر ایسا ہو کہ کوئی دوسرا رسول اس کتاب کی تصدیق کرتا ہوا تمہارے پاس آئے جو تمہارے ساتھ ہے تو ضروری ہے کہ تم اسے مانو اور اس کی تائید کرو"۔[۴۳]

حاشیہ میں مزید وضاحت کرتے ہیں کہ

"اس آیت میں میثاق النبیین کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ نبیوں کے بارے میں میثاق دوسرا یہ کہ وہ میثاق جو نبیوں سے لیا گیا تھا، بعض مفسروں نے پہلا مطلب اختیار کیا ہے اور ان میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں اور بعضوں نے دوسرا، ہم نے پہلے کو ترجیح دی ہے"۔[۴۴]

## وحدتِ دین

مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں متعدد مقامات پر وحدتِ دین پر گفتگو کی ہے، بالخصوص سورہ افاتحہ کی تفسیر "اھدنا" میں انھوں نے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ مولانا آزاد نے جس انداز سے مسئلہ اٹھایا ہے اس سے

اہلِ علم میں غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں اور مولانا آزاد کو وحدتِ ادیان کے مبلغین کی صف میں کھڑا کیا گیا ہے۔ مولانا کا موقف ان کے الفاظ میں یہ ہے:

"فطرتِ الٰہی کی راہ کائناتِ ہستی کے ہر گوشے میں ایک ہی ہے وہ نہ تو ایک سے زیادہ ہو سکتی ہے نہ باہم دگر مختلف۔ پس یہ ضروری تھا کہ ہدایت بھی اول دن سے ایک ہی ہوتی اور ایک ہی طرح پر تمام انسانوں کو مخاطب کرتی۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے خدا کے جتنے پیغمبر پیدا ہوئے خواہ وہ کسی زمانے اور کسی گوشے میں ہوئے ہوں سب کی راہ ایک ہی تھی اور سب خدا کے ایک ہی عالم گیر قانونِ سعادت کی تعلیم دینے والے تھے۔ یہ عالم گیر قانونِ سعادت کیا ہے؟ ایمان اور عملِ صالح کا قانون ہے یعنی ایک پروردگارِ عالم کی پرستش کرنی اور نیک عملی کی زندگی بسر کرنی۔ اس کے علاوہ اور اس کے خلاف جو کچھ بھی دین کے نام سے کہا جاتا ہے دین کی حقیقی تعلیم نہیں ہے۔"[۴۵]

"دنیا میں کوئی بانی مذہب بھی ایسا نہیں ہوا ہے جس نے ایک ہی دین پر اکٹھے رہنے اور تفرقہ و اختلاف سے بچنے کی تعلیم نہ دی ہو، سب کی تعلیم یہی تھی کہ خدا کا دین بچھڑے ہوئے انسانوں کو جمع کر دینے کے لیے ہے الگ الگ کر دینے کے لیے نہیں ہے پس ایک پروردگارِ عالم کی بندگی و نیازمندی میں سب متحد ہو جاؤ۔"[۴۶]

"وہ (قرآن) کہتا ہے مذاہب کی تعلیم دو قسم کی باتوں سے مرکب ہے ایک قسم تو وہ ہے جو ان کی روح و حقیقت ہے، دوسری وہ ہے جن سے ان کی ظاہری شکل و صورت آراستہ کی گئی ہے پہلی چیز اصل ہے، دوسری فرع ہے پہلی چیز کو وہ دین سے تعبیر کرتا ہے دوسری کو شرع اور نسک سے اور اس کے لیے منہاج کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے، شرع اور منہاج کے معنی راہ کے ہیں اور نسک سے مقصود عبادت کا طور طریقہ ہے پھر اصطلاح میں شرع قانونِ مذہب کو کہنے لگے اور نسک عبادت کو۔ وہ (قرآن) کہتا ہے مذاہب

میں جس قدر بھی اختلاف ہے وہ دین کا اختلاف نہیں، ظواہر کا ہے۔ روح کا نہیں، صورت کا ہے اور ضروری تھا کہ یہ اختلاف ظہور میں آتا۔"

مولانا آزاد کی یہ ساری بحث آسمانی مذاہب اور انبیاء کی شریعتوں کے پس منظر میں ہے نہ کہ مشرکانہ اور ملحدانہ مذاہب کے تناظر میں۔ چنانچہ مذکورہ بحث میں انھوں نے جن آیات سے استدلال کیا ہے ان آیات کی تفسیر کے تحت اس پر مزید روشنی ڈالی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے وحدتِ دین کی وکالت کی ہے، نہ کہ وحدتِ ادیان کی۔ انھوں نے جن مقامات پر وحدتِ ادیان کی اصطلاح استعمال کی ہے اس سے ان کی مراد وحدتِ دین ہے، نہ کہ تمام موحدانہ اور مشرکانہ مذاہب کی وحدت۔ چنانچہ آیتِ قرآنی "وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ" (الانبیاء: ۲۵) کی تشریح کرتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں:

> "یہ استدلال وحدتِ ادیان کی اصلِ عظیم کا استدلال ہے جس پر قرآن نے اپنی دعوت کی تمام بنیادیں استوار کی ہیں۔ وہ کہتا ہے یہ تعلیم حق ہے جو میرے ساتھیوں کے پاس ہے اور اسی طرح وہ تمام تعلیمیں بھی موجود ہیں جو میں پیش کر رہا ہوں۔ پھر اگر بغیر کسی اختلاف کے دنیا کے ہر عہد اور ہر گوشے کی دینی تعلیم ایک ہی رہی ہے اور سب نے توحید و خدا پرستی ہی کی طرف بلایا ہے تو کیا یہ عالم گیر وحدت تعلیم اور باہم دگر تصدیق و توثیق کی موجودگی کا ایک قطعی ثبوت نہیں ہے چنانچہ آیت ۲۵ میں وضاحت کر دی کہ دعوتِ قرآن سے پہلے جتنی دعوتیں بھی دنیا میں آچکی ہیں، ان سب کی پکار اس کے سوا کچھ نہیں رہی ہے کہ لا الٰہ الا انا فاعبدون"[۴۸]

مولانا آزاد عام طور پر اپنی بحث کے مستدلات کا حوالہ نہیں دیتے اور اپنا مآخذ نہیں بیان کرتے اس لیے مولانا آزاد کی اس پوری بحث کو وحدتِ ادیان کی وکالت سمجھ کر ناقابلِ اعتبار بنا دیا گیا ہے۔ حالانکہ اس سلسلہ میں مولانا آزاد کے پیش رو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں۔ شاہ صاحب نے اپنی شہرہ آفاق کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں ایک پورا باب اس مسئلہ پر وقف کیا ہے اور انہی آیات سے استدلال کیا ہے

جن کو مولانا آزاد نے پیش کیا ہے۔ شاہ صاحب کی اس بحث کا خلاصہ یہ ہے۔

"اصلِ دین ایک ہے جس پر تمام انبیاء علیہم السلام کا اتفاق ہے، اختلاف تو شرائع اور منہاج میں ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ عبادت اور استعانت کے معاملہ میں اللہ کی توحید پر اور جو چیزیں اس کے شایانِ شان نہیں ہے ان سے پاکی اور اس کے ساتھ شرک کرنے کی حرمت پر تمام انبیاء علیہم السلام کا اجماع ہے۔"[۴۹]

شاہ صاحب نے دین کی وحدت اور شرائع اور مناہج کے اختلاف کی تفصیل کے بعد ایک اور باب رقم کیا ہے "الحاجة الی دین ینسخ الادیان" یعنی ایک ایسے دین کی ضرورت جو تمام ادیان کے لیے ناسخ ہے، یہ باب گویا تتمہ اور حاصل ہے گزشتہ باب کا جس کی وجہ سے شاہ صاحب کے بارے میں کسی کو وہ غلط فہمی نہ ہوئی جو مولانا آزاد کے بارے میں ہوئی کیوں کہ مولانا آزاد نے وحدتِ دین کی بحث تو تفصیل سے کی مگر اس کے دوسرے حصہ کو موضوعِ بحث نہیں بنایا اور غلط فہمی کی دوسری وجہ وحدتِ ادیان کی اصطلاح کا استعمال تھا۔

## قرآن اور اصلاحِ امت

شاہ ولی اللہ نے قرآن کا ترجمہ اس لیے کیا تھا کہ جن باطل خیالات، فاسد اعمال اور مہلک رسوم میں مسلمان مبتلا ہوتے جا رہے ہیں ان کا ازالہ ہو اور قرآن کی روشنی فکر و عمل کی تاریک راہوں کو منور کر دے۔ شاہ صاحب نے اس سلسلہ میں اپنے ترجمۂ قرآن فتح الرحمٰن کو بچوں، بڑوں، امراء، سپاہی، صنعت گر، عالم اور عوام سب کو پڑھنے کا مشورہ دیا۔ اس کے علاوہ قرآن میں جن گمراہ قوموں کے عقیدہ و عمل پر تنقید کی گئی ہے ان کی خصوصیات و امتیازات کو متعین کر کے اپنے زمانہ کے حالات پر منطبق کیا اور ان سے پرہیز کرنے کی دعوت دی اور تدبیر بتائی۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر میں اس پہلو کو خاص طور سے نمایاں کیا ہے۔ شاہ صاحب جب یہود و نصاریٰ اور منافقین کے احوال پر گفتگو کرتے ہیں تو ان کی مثالیں معاصر مسلم معاشرہ میں دکھاتے ہیں شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"قرآن مجید کی تلاوت کے وقت یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ اس میں

مباحثہ ایک خاص قوم سے تھا جو گذر گئی بلکہ بمصداق حدیث لتتبعن سنن من قبلکم زمانۂ نبوی میں کوئی بلا نہ تھی مگر یہ کہ اس کا نمونہ آج بھی موجود ہے۔ اس لیے مقصود اصلی ان مقاصد کے لیے کلیات کا بیان ہے نہ کہ ان حکایات کی خصوصیات"۔[۵۰]

مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن اسی جذبہ سے سرشار ہو کر قلم بند کیا ان کے پیش نظر بھی امت مسلمہ کی اصلاح تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

"اصلاح کے لیے پہلا کام یہ تھا کہ مسلمانوں کو قرآن کے براہ راست مطالعہ وعمل کی دعوت دی جائے لیکن یہ دعوت کچھ سود مند نہ تھی جبکہ قرآن کے فہم ومطالعہ کا سامان مفقود تھا"۔[۵۱]

چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد جن مقامات پر یہود ونصاریٰ، منافقین اور دیگر گمراہ قوموں کی سرگزشت حیات پر قلم اٹھاتے ہیں تو موجودہ مسلم معاشرہ کا بھی اسی احساس ذمہ داری کے ساتھ محاسبہ کرتے ہیں۔ مثلاً سورہ التوبہ کی آیت ۱۷ میں ہے مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسَاجِدَ اللَّهِ شَاهِدِينَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۚ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ ۝

(مشرکوں کو اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں۔ ایسی حالت میں کہ وہ خود اپنے شرک کا اعتراف کر رہے ہیں یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے سارے اعمال اکارت گئے اور وہ عذاب آتش میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔)

مولانا آزاد نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"قریش مکہ کو خانۂ کعبہ کی مجاوری اور حاجیوں کے کاروبار کے منتظم ہونے کا بہت غرور تھا اور جب ایک جماعت اعتقاد وعمل کی حقیقت سے محروم ہو جاتی ہے تو اسی طرح کے رسوم ومظاہر کو ہر طرح کی بزرگی وسعادت کا ذریعہ سمجھنے لگتی ہے۔ کسی زیارت گاہ کا متولی ہونا جو اثر ورسوخ رکھتا ہے وہ بڑے سے بڑے اور بہتر سے بہتر مومن ومتقی کو بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایک صالح ومتقی مسلمان کو کوئی نہیں پوچھے گا لیکن ایک بدعمل مجاور یا متولی درگاہ

کی ہزاروں آدمی قدم بوسی کریں گے"۔ [۵۲]

سورہ توبہ کی دوسری آیت ہے۔ "یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ" (التوبہ: ۳۴)

مولانا آزاد نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے یہود و نصاریٰ کے علماء اور مشائخ کی گمراہی کے مظاہر بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ مثلاً حرام کو حلال اور حلال کو حرام بنانا، ناجائز طریقہ پر مال کھانا، فیصلوں میں رشوت لینا، مذہبی رسوم کی ادائیگی پر معاوضہ لینا، اللہ کی کتاب کے علم سے عوام کو محروم رکھنا، اپنے آپ کو نجات کا ذریعہ باور کرانا، مغفرت کے پروانے فروخت کرنا، مصنوعی تبرکات و آثار کا اعتقاد پیدا کرنا، شرعی حیلے بہانے تراشنا، ایصال ثواب کے لیے رسمیں اور رقمیں مقرر کرنا اور دین کو پیشہ بنا لینا وغیرہ۔ آخر میں مولانا نے اس صورتِ حال کو اپنے موجودہ مسلم معاشرہ پر منطبق کیا ہے اور اسے شاہ ولی اللہ کے حوالہ سے مؤکد کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "قرآن نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے ان کی اس گمراہی کی طرف اس لیے اشارہ کیا تاکہ واضح ہو جائے کہ ان کا ایمان سے محروم ہو جانا اور دینِ حق کا عملاً ترک کر دینا دراصل ان کے علماء کی ان گمراہیوں اور دنیا پرستیوں کا نتیجہ تھا۔
>
> لیکن آج مسلمان اور مسلمانوں کے علماء و مشائخ اپنی حالت پر نظر ڈالیں اور غور کریں کہ کیا وہ بھی ٹھیک ٹھیک احبار و رہبان کے قدم بقدم نہیں چل رہے ہیں؟ اور کیا اکل اموال بالباطل کی یہ تمام صورتیں کسی نہ کسی بھیس میں یہاں بھی کام نہیں کر رہی ہیں؟ حضرت شاہ ولی اللہ نے اب سے دو سو برس پہلے الفوز الکبیر میں لکھا تھا کہ اگر احبار یہود کی حالت دیکھنی چاہتے ہو تو آج کے علماء کو دیکھ لو، اور اگر عیسائیوں کے رہبان کا نقشہ کھینچنا چاہتے ہو تو آج کل کے مشائخ کے سامنے بیٹھ کر کھینچ لو"۔ [۵۳]

سورہ الانعام میں ہے : قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰٓ اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ (الانعام: ۶۵)

مولانا آزاد نے آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے نزدیک یہ بھی ایک عذاب ہے کہ کوئی امت ایک طریقہ پر جمع رہنے کی جگہ مختلف گروہ بندیوں میں بٹ جائے اور ہر گروہ دوسرے گروہ کو اپنی شدت کا مزہ چکھانے لگے۔ افسوس کہ مسلمان بھی اسی عذاب میں مبتلا ہوئے"[۵۴]

مولانا آزاد نے سورۂ طٰہٰ کی آیت ۵۱ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى کے تفسیری نوٹ میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس سلسلہ میں نہایت وقیع اور سبق آموز اور مسلمانوں کے موجودہ اختلافات کو دور کرنے میں معاون ہے[۵۵]

# حواشی ومراجع


۱ مولانا ابوالکلام آزاد، تذکرہ، لاہور ص ۲۶۸ ۲ ایضاً ص ۲۱۶

۳ مولانا ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن، ساہتیہ اکیڈمی دہلی ۱۹۶۲ء ۱/۳۵۵

۴ شاہ ولی اللہ دہلوی، فتح الرحمٰن، قلمی سبحان اللہ کلکشن مولانا آزاد لائبریری، اے ایم یو، مقدمہ

۵ ترجمان القرآن ۱/۴۷، دیباچہ ۶ ایضاً ۳، دیباچہ

۷ شاہ ولی اللہ دہلوی، الفوز الکبیر، اردو ترجمہ مکتبہ برہان دہلی، ص ۳۰

۸ ترجمان القرآن ۱/۳۳ دیباچہ ۹ ایضاً ص ۴۲

۱۰ الفوز الکبیر ص ۶۶ ۱۱ ترجمان القرآن ۱/۴۰، دیباچہ

۱۲ الفوز الکبیر ص ۸۴ ۱۳ ترجمان القرآن ۱/۳۶ دیباچہ

۱۴ الفوز الکبیر ص ۶ ۱۵ ایضاً ص ۵۸

۱۶ ترجمان القرآن ۱/۳۶، دیباچہ ۱۷ ایضاً ص ۳۹ ۱۸ الفوز الکبیر ص ۳۲

۱۹ ایضاً ص ۸۳ ۲۰ ترجمان القرآن ۱/۳۷ دیباچہ

۲۱ ترجمان القرآن ۲/۱۶۲ ۲۲ فتح الرحمٰن، مجمع ملک فہد، مدینہ منورہ ۱۴۱۷ھ، البقرہ ۲۵

۲۳ھ ترجمان القرآن ۲/ ۷۸۶
۲۴ھ فتح الرحمٰن، الانعام : ۱۳۰
۲۵ھ ترجمان القرآن ۴/ ۳۱۰
۲۶ھ فتح الرحمٰن، بنی اسرائیل : ۸۴
۲۷ھ ایضاً، المومنون : ۳۱
۲۸ھ ترجمان القرآن ۴/ ۸۸۸
۲۹ھ فتح الرحمٰن، المائدہ : ۲
۳۰ھ الفوز الکبیر ص ۳۶
۳۱ھ تذکرہ ص ۵۷
۳۲ھ ترجمان القرآن ۲/ ۵۸۷
۳۳ھ فتح الرحمٰن البقرہ : ۱۵۶
۳۴ھ ترجمان القرآن ۲/ ۴۰
۳۵ھ فتح الرحمٰن، البقرہ : ۲۵۶
۳۶ھ ترجمان القرآن ۲/ ۲۳۲
۳۷ھ الفوز الکبیر ص ۲۵
۳۸ھ ترجمان القرآن ۳/ ۷۰۲
۳۹ھ فتح الرحمٰن الانبیاء : ۹۹
۴۰ھ ترجمان القرآن ۴/ ۷۴
۴۱ھ فتح الرحمٰن الحج : ۶۹
۴۲ھ ترجمان القرآن ۴/ ۸۴۴ ۴۳ھ ایضاً ۲/ ۳۲۵
۴۴ھ ایضاً ص ۸۵۸ ۴۵ھ ایضاً ۱/ ۳۵۸
۴۶ھ ایضاً ص ۳۵۹ ۴۷ھ ایضاً ص ۳۶۷ ۴۸ھ ایضاً ۴/ ۶۸۵
۴۹ھ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغۃ، دمشق ۱۳۵۲ھ اول ص ۸۶
۵۰ھ الفوز الکبیر ص ۳۳ ۵۱ھ ترجمان القرآن ۱/ ۸، دیباچہ
۵۲ھ ایضاً ص ۲۴۴ ۵۳ھ ایضاً ص ۴۰۸ ۵۴ھ ایضاً ۲/ ۴۳۷ ۵۵ھ ایضاً ۴/ ۶۵۲ تا ۶۶۲

# حلف الفضول

## عصری معنویت

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

سیرتِ نبوی کے ماقبلِ بعثت اہم واقعات میں سے ایک حِلف الفضول ہے۔ اُس دور میں جب مظلومین کے لیے حصول انصاف کا کوئی منظّم ادارہ موجود نہیں تھا، بعض قبائل کے سربرآوردہ لوگوں کی کوششوں سے اس معاہدے کی تشکیل عربوں کا ایک قابلِ فخر کارنامہ ہے، لیکن اس معاہدے کی صرف تاریخی حیثیت ہی نہیں ہے بلکہ آج کے دور میں بھی اس کی معنویت تلاش کی جاسکتی ہے۔

### اہمیت

اسلام سے قبل عربوں میں خاندانی اور قبائلی نظام بہت مستحکم تھا۔ افراد اپنے خاندان اور قبیلے سے شدید وابستگی رکھتے تھے، کوئی کام صحیح ہو یا غلط، کوئی فیصلہ درست ہو یا نادرست، عدل پر مبنی ہو یا ظلم پر، کسی کی حمایت کرنی ہو یا مخالفت، کسی کو مدد پہنچانی ہو یا اس کے خلاف لڑنا ہو، تمام افرادِ قبیلہ اس میں برابر کے شریک رہتے تھے، درید بن الصمۃ نے اس کی ترجمانی یوں کی ہے:

وھل انا الّا من غَزِیَّۃ ان غوت غویت وان ترشد غزیۃ ارشد[1]

(میں تو قبیلہ غزیہ کا ایک فرد ہوں، اگر وہ غلط راہ پر چلے گا تو میں بھی غلط راہ پر چلوں گا اور اگر وہ صحیح راستے پر ہوگا تو میں بھی اسی راستے کو اختیار کروں گا۔

اسی طرح قبیلے کے کسی بھی ایک فرد کی حق تلفی اور اس پر ظلم و زیادتی پورے

قبیلے کی مخالفت مول لینے کے مترادف تھی۔ قبائلی عصبیت ہی کی بنا پر ان میں باہم آویزشیں اور جنگیں ہوتی رہتی تھیں جن کا سلسلہ سالوں تک دراز رہتا تھا۔ ایسے ماحول میں مختلف قبائل سے تعلق رکھنے والے چند سنجیدہ، بااثر اور صاحبِ حیثیت لوگوں کا قبائلی عصبیت سے اوپر اٹھ کر انسانی اور اخلاقی بنیادوں پر اکٹھا ہونا اور ہر حال میں ظلم کے ازالہ اور مظلوم کے دفاع کا عہد کرنا ایک غیر معمولی واقعہ تھا، اسی بنا پر اس معاہدے کو عربوں کی تاریخ میں سب سے محترم، بابرکت اور افضل معاہدہ قرار دیا گیا ہے۔

حضرت حکیم بن حزامؓ (م ۵۴ھ) فرماتے ہیں:

| | |
|---|---|
| وکان اشرف حلف کان قطّ[۲] | یہ تاریخ کا سب سے قابلِ احترام معاہدہ تھا۔ |

محمد بن حبیب بغدادی (م ۲۴۵ھ) نے لکھا ہے:

| | |
|---|---|
| کان حلفًا لم یسمع الناس بحلف قط کان اکرم منه ولا افضل منه[۳] | یہ ایسا معاہدہ تھا کہ اس سے زیادہ قابلِ احترام واکرام اور اس سے افضل کسی اور معاہدہ کا لوگوں نے کبھی تذکرہ نہیں سنا۔ |

سہیلی (م ۵۸۱ھ) اور ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) نے لکھا ہے:

| | |
|---|---|
| وکان حلف الفضول اکرم حلف سمع به واشرفه فی العرب[۴] | حلف الفضول عرب کا سب سے زیادہ قابلِ تکریم اور محترم معاہدہ تھا جس کا تذکرہ سنا گیا ہو۔ |

جو قبائل اس معاہدہ میں شریک نہیں ہو سکے تھے ان کے سربرآوردہ لوگ اس کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس میں عدم شرکت کو اپنی محرومی تصور کرتے تھے۔ عتبہ بن ربیعہ نے جو عہدِ جاہلیت میں مکہ میں سرداروں میں سے تھا اور قبیلۂ بنو عبد شمس سے تعلق رکھتا تھا، ایک مرتبہ حلف الفضول کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

"یہ بہت اچھا معاہدہ تھا۔ اللہ کی قسم اگر میں اپنی قوم سے الگ ہو کر کسی معاہدہ میں شریک ہو سکتا تو حلف الفضول میں ضرور شرکت کرتا۔"[۵]

## زمانہ

مورخین اور اصحابِ سیر نے لکھا ہے کہ حلف الفضول کا زمانہ حرب الفجار چہارم کے بعد کا ہے۔ عرب کے مختلف قبائل کے درمیان عہدِ جاہلیت میں ہونے والی جنگوں میں حرب الفجار بہت مشہور رہے۔ یہ جنگ وقفے وقفے سے سالوں تک جاری رہی تھی۔ اس نام سے ہونے والی چوتھی جنگ جسے حرب البراض کا بھی نام دیا گیا ہے، عام الفیل کے بیسویں سال شوال میں ہوئی تھی۔ اس کے اگلے ماہ ذی قعدہ میں یہ معاہدہ وجود میں آیا تھا[۱] ابن حبیب بغدادی کی ایک دوسری روایت کے مطابق یہ معاہدہ بعثتِ نبوی سے پانچ سال قبل طے پایا تھا[۲] اس اعتبار سے اس کا زمانہ ۳۵ عام الفیل قرار پاتا ہے۔

سہیلی اور ابن کثیر حلف الفضول کا زمانہ تو بعثت سے بیس سال قبل ماہ ذی قعدہ ہی قرار دیتے ہیں، لیکن وہ کہتے ہیں کہ حرب الفجار اس سے ایک ماہ قبل شوال میں نہیں بلکہ چار ماہ قبل شعبان میں ہوئی تھی[۳]

## سبب

اس معاہدہ کا سبب کیا تھا؟ اس سلسلے میں بعض مورخین مثلاً ابن قتیبہ (م ۲۷۶ھ) ابن الجوزی (م ۵۹۷ھ) اور دیار بکری (م ۹۶۶ھ) نے لکھا ہے کہ قبائلِ قریش حرم کے تقدس کو پامال کرتے ہوئے اس میں ایک دوسرے پر ظلم کرتے تھے[۴] اس سے انھیں روکنے کے لیے یہ معاہدہ وجود میں آیا۔ علامہ شبلی (م ۱۹۱۴ء) نے بھی اس کا عمومی سبب بیان کیا ہے، انھوں نے لکھا ہے:

"لڑائیوں کے متواتر سلسلے نے سیکڑوں گھرانے برباد کر دئے تھے اور قتل و سفاکی موروثی اخلاق بن گئے تھے، یہ دیکھ کر بعض طبیعتوں میں اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی"[۵] بعض حضرات نے لکھ دیا ہے کہ اس کے بہت سے اسباب تھے[۶]

لیکن بیشتر مورخین و اصحابِ سیر نے اس کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ یمن کے قبیلے زبید کا ایک تاجر مکہ مکرمہ آیا۔ اس نے قبیلۂ سہم کے ایک شخص عاص

ابن وائل[۲۱] کے ہاتھ اپنا کچھ سامان فروخت کیا۔ اس نے سامان تو لے لیا لیکن اس کی قیمت ادا کرنے میں ٹال مٹول کی۔ جب براہِ راست مطالبوں سے کام نہ چلا اور اسے قیمت ملی نہ اپنا مال واپس ملا تو اس نے بعض قبائل سے مدد چاہی، مگر کسی نے اس کی مدد نہیں کی بلکہ الٹا اسے ڈانٹا پھٹکارا، مایوس ہو کر ایک دن صبح سویرے زُبیدی کوہِ ابوقیس پر چڑھا اور وہاں سے اس نے ہجو و طنز کے چند اشعار میں اپنی مظلومی کی داستان سنائی۔ اس وقت قبائلِ قریش کے سردار خانۂ کعبہ کے اردگرد اپنی مجلسوں میں موجود تھے، انھوں نے اپنے دلوں میں اشعار کی چوٹ محسوس کی۔ ان کی مجلسوں میں اس معاملہ کا چرچا ہوا بالآخر کچھ بااثر اور انصاف پرور لوگوں نے نہ صرف اس زبیدی کا مال واپس دلوایا بلکہ ان کی کوششوں سے "حلف الفضول" کی شکل میں ایک تاریخی معاہدہ بھی تشکیل پایا۔

## معاہدہ میں شریک قبائل اور نمایاں افراد

عربوں میں مختلف اسباب سے خانہ جنگی برپا رہتی تھی، اس لیے قبائل ایک دوسرے کے حلیف بن جاتے تھے۔ اور باہم مل کر ایک اتحاد قائم کر لیتے تھے، ایک موقع پر قبائلِ قریش دو گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک "مطیبین" کہلاتا تھا اور دوسرا "احلاف"۔ مطیبین میں بنو عبد مناف بن قصی، بنو اسد بن عبد العزیٰ بن قصی، بنو زہرہ بن کلاب، بنو تیم بن مرہ اور بنو الحارث بن فہر شامل تھے، جب کہ احلاف میں بنو عبد الدار بن قصی، بنو سہم بن عمرو، بنو جمح بن عمرو، بنو مخزوم بن یقظہ اور بنو عدی بن کعب تھے۔

مورخین نے اس موقع کا بھی تذکرہ کیا ہے جب یہ دو اتحاد وجود میں آئے تھے قصی کے بیٹوں میں عبد الدار معاشی اعتبار سے کچھ کمزور تھے۔ اس لیے انھوں نے حجابہ، ندوہ، سقایہ، رفادہ اور لواء کے مناصب ان کو دیے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد دوسرے بیٹوں کے خاندانوں کو جن میں بنو عبد مناف پیش پیش تھے، اپنی حق تلفی کا احساس ہوا اور انھوں نے کچھ مناصب بنو عبد الدار سے لے لینے کا ارادہ کیا۔ دوسری جانب بنو عبد الدار ان میں سے ایک منصب بھی

چھوڑنے پر تیار نہ تھے، اس موقع پر جو خاندان بنو عبد مناف کے حامی تھے انھوں نے خوشبو کے ایک برتن میں ہاتھ ڈال کر عہد کیا تھا کہ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔ اس لیے وہ "مطیّبین" کہلائے، دوسرے گروہ نے اونٹ ذبح کر کے اس کے خون میں ہاتھ ڈبو کر اور خون چاٹ کر ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کا عہد کیا تھا، اس لیے ان کا نام "احلاف" پڑا۔ بہر حال اس موقع پر ان کے درمیان جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی اور باہم اس بات پر صلح ہو گئی تھی کہ لواء اور حجابہ کے مناصب عبد الدار کے پاس اور سقایہ اور رفادہ کے مناصب بنو عبد مناف کے پاس رہیں گے۔[۱۳]

حلف الفضول میں صرف "مطیّبین" شریک ہوئے تھے۔ "احلاف" اس میں شامل نہ تھے، اس کا سبب یہ تھا کہ زبیدی تاجر کا مال ہڑپ کرنے والا شخص بنو سہم سے تعلق رکھتا تھا، اس لیے "احلاف" میں شامل قبائل کے سرداروں نے اس اندیشے سے اس کی دادرسی نہیں کی تھی کہ کہیں بنو سہم اپنے آدمی کی حمایت میں ہمارے گروہ ہی سے نہ نکل جائیں جس کی بنا پر ہم مطیّبین کے مقابلے میں کمزور ہو جائیں۔ "احلاف" کی جانب سے اس کمزوری کے مظاہرہ کی وجہ سے معاہدہ طے پاتے وقت انھیں اس میں شریک نہیں کیا گیا تھا،[۱۴] یہ بھی ہو سکتا ہے کہ معاملہ بنو سہم کے ایک شخص کا تھا اس لیے احلاف بلائے جانے کے باوجود وہاں نہ گئے ہیں۔

مورخین نے صراحت کی ہے کہ اس معاہدے کے محرک اور داعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا جناب زبیر بن عبد المطلب تھے، ان کی تحریک پر "مطیّبین" میں شامل قبائل بنو تیم کے سردار عبد اللہ بن جدعان کے گھر میں اکٹھا ہوئے اور وہیں یہ معاہدہ تشکیل پایا،[۱۵] البتہ مسعودی (م ۳۴۶ھ) کا بیان ہے کہ قبائل قریش پہلے دار الندوہ میں جمع ہوئے جہاں وہ اہم امور میں باہم مشورہ کے لیے اکٹھا ہوا کرتے تھے۔ وہاں انھوں نے معاہدہ طے کیا۔ پھر عبد اللہ بن جدعان کے گھر جا کر سب نے اس معاہدہ پر حلف لیا۔[۱۶]

جناب زبیر بن عبد المطلب بنو ہاشم بن عبد مناف کے سردار تھے، ان کے

والد عبدالمطلب نے انھیں اپنی زندگی ہی میں اپنا وصی اور سربراہِ خاندان مقرر کردیا تھا اور اہم کاموں کی ذمہ داری سونپ دی تھی جن میں دو مناصب سقایا اور رفادہ بھی تھے۔ حربِ الفجار میں انھوں نے ہی بنو ہاشم کی قیادت کی تھی اور ابن اسحاق (م ۱۵۱ھ) اور ابن ہشام (م ۲۱۳ھ) کا بیان ہے کہ انھوں نے خانۂ کعبہ کی تعمیر میں بھی حصہ لیا تھا۔[۱۷]

عبداللہ بن جدعان قبیلۂ بنو تیم کے سردار تھے۔ عہدِ جاہلیت کے سخی اور فیاض لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ شراب اور جوئے سے اجتناب کرتے تھے، غلاموں کو خرید کر آزاد کرتے تھے، حضرت صہیب (بن سنان) رومیؓ کو انھوں نے ہی خرید کر آزاد کیا تھا۔ قحط سالی کے زمانے میں وہ بڑے پیمانے پر عام لوگوں کی روزی کا سامان مہیا کرتے تھے۔ انھوں نے اتنی بڑی لگن بنوا رکھی تھی کہ سوار اپنی سواری پر بیٹھے بیٹھے اس میں سے نکال کر کھا سکتا تھا اور آدمی دھوپ سے بچنے کے لیے اس سایہ میں کھڑا ہو سکتا تھا، ایک مرتبہ اس میں ایک بچہ گر کر ڈوب گیا تھا۔[۱۸]

صحیح مسلم میں ہے کہ ایک موقع پر حضرت عائشہؓ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے عرض کیا:

| | |
|---|---|
| یا رسول اللہ ابن جدعان | اے اللہ کے رسول۔ ابن جدعان |
| کان فی الجاھلیۃ یصل | جاہلیت میں صلہ رحمی کرتے تھے اور |
| الرحم ویطعم المسکین۔[۱۹] الخ | مسکین کو کھانا کھلاتے تھے۔۔۔۔ الخ |

محمد بن حبیب بغدادی نے حضرت عائشہؓ کے بعض بیانات نقل کیے ہیں جن سے عبداللہ بن جدعان کی شخصیت پر مزید روشنی پڑتی ہے، ان کے مطابق عبداللہ بن جدعان قریش کے بڑے سرداروں میں سے تھے، ہر سخت گھڑی میں وہ لوگوں کے کام آتے تھے، حربِ فجار جس کے لیے لوگوں نے ایک سال تک زبردست تیاری کی تھی، اس کے لیے قریش عبداللہ بن جدعان کے گھر سے نکلے تھے، اس جنگ میں عبداللہ بن جدعان نے قیادت کی تھی، فوجیوں کے لیے اسلحہ فراہم کیے تھے اور ان کے درمیان مال تقسیم کیا تھا۔[۲۰]

سہیلی نے عبداللہ بن جدعان کو "ابن عمِّ عائشہ" (حضرت عائشہ کا چچازاد بھائی) لکھا ہے،[۲۱] غالباً انہی کی متابعت میں مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور مولانا مودودی

نے بھی یہی لکھ دیا ہے[۲۲] لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ابن کثیر نے ان کا پورا سلسلۂ نسب بیان کرتے ہوئے صراحت سے لکھا ہے کہ وہ حضرت ابوبکر کے والد کے چچازاد بھائی تھے (وھوابن عم والد ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ)[۲۳]

اس معاہدے کے محرک اور داعی زبیر بن عبدالمطلب تھے لیکن لوگ عبداللہ بن جدعان کے گھر پر اکٹھا ہوئے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ عبداللہ بن جدعان قبائلِ قریش کے سرداروں میں سب سے بااثر، سب سے مالدار اور سب سے معمر تھے۔ ابن ہشام نے لکھا ہے:

| | |
|---|---|
| فاجتمعوا فی دارا عبد اللہ بن جدعان لشرفہ وسنہ، فکان حلفھم عندہ[۲۴] | یہ لوگ عبداللہ بن جدعان کے گھر میں اکٹھا ہوئے، اس کے بااثر اور معمر ہونے کی وجہ سے، اور اسی کے پاس ان لوگوں نے حلف لیا۔ |

ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے بھی اسی جانب اشارہ کیا ہے:

"عبداللہ بن جدعان کے مکان میں لوگ ضیافت کی دعوت پر جمع ہوئے، وہ بہت بوڑھا اور بااثر بھی تھا، اور بعض دفینوں کے ملنے سے بہت مالدار بھی تھا اور غالباً اسی کا مکان سب سے کشادہ بھی تھا..... اس لیے ممکن ہے محرک زبیر ہوں اور محض ان کی کم سنی اور کم مالی کی وجہ سے ابن جدعان کی سرپرستی حاصل کی گئی ہو اور اس کے گھر پر جلسہ کیا گیا اور حسبِ عادت ضیافت ہوئی ہو۔"[۲۵]

## آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شرکت

اس معاہدے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک تھے، صحابیٔ رسول حضرت حکیم بن حزامؓ (ام المومنین حضرت خدیجہ کے بھتیجے جو حرب الفجار میں شریک تھے اور انھیں آں حضرتؐ کی بعثت سے قبل بھی آپ کی دوستی کا شرف حاصل تھا) فرماتے ہیں:

"ابن جدعان کے گھر میں جو معاہدہ ہوا تھا اس میں میں نے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا، معاہدہ کی دستاویز زبیر بن عبد المطلب نے لکھی تھی۔"[۲۶]

خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فخریہ انداز میں اس معاہدہ میں اپنی شرکت کا ذکر فرمایا ہے، حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

| | |
|---|---|
| شہدت حلف المطیبین | میں نے اپنی نوعمری میں اپنے چچاؤں |
| مع عمومتی وانا غلام | کے ساتھ حلف المطیبین میں شرکت |
| فما احب ان لی حمر | کی تھی، اس معاہدے کو توڑنے کے |
| النعم وانی انکثه[۲۷] | لیے اگر مجھے سرخ اونٹ بھی دیے |
| | جاتے تو میں اس پر تیار نہ ہوتا۔ |

احمد محمد شاکر (محقق مسند احمد (م ۱۳۷۷ھ)) فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔[۲۸] علامہ ابن حجر (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں "امام احمد کے علاوہ اس حدیث کو ابو یعلی، ابن حبان اور حاکم نے بھی حضرت عبد الرحمٰن بن عوف سے مرفوعاً روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔"[۲۹]

حافظ ابن کثیر نے اپنی تاریخ البدایہ والنہایہ میں اس روایت کو بیہقی سے نقل کیا ہے، لیکن اس میں حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کا واسطہ نہیں ہے، اسی طرح انھوں نے اس روایت کو حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی نقل کیا ہے۔[۳۰]

روایتِ بالا میں "حلف المطیبین" کے الفاظ ہیں۔ عموماً مورخین نے اس سے مراد وہ معاہدہ لیا ہے جو قریش کے بعض قبائل کے درمیان بعض مناصب (رفادہ، حجابہ، سقایہ، لواء وغیرہ) کے سلسلہ میں ہوا تھا اور جس کے موقع پر انھوں نے خوشبو کے برتن میں ہاتھ ڈال کر حلف اٹھایا تھا اور مطیبین کہلائے تھے۔ وہ معاہدہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے قبل کا ہے۔ اس لیے یہاں "حلف المطیبین" سے مراد حلف الفضول ہے۔ اس میں لفظ "المطیبین" یا تو کسی راوی کی جانب سے ادراج (اضافہ) ہے یا چونکہ اس معاہدہ میں بھی صرف وہی قبائل شریک تھے جن پر مطیبین کا اطلاق ہوتا تھا، اس لیے اس کو بھی "حلف المطیبین" کہہ دیا گیا۔[۳۱]

اس معاہدہ کے وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک عام مورخین واصحاب سیر کے مطابق بیس۲۰ سال تھی۔ منمق کی ایک روایت میں اسے بعثت نبوی سے پانچ سال قبل کا واقعہ بتایا گیا ہے[۳۲] اس اعتبار سے اس وقت حضورؐ کی عمر ۲۵ سال قرار پاتی ہے۔

## وجہ تسمیہ

اس معاہدہ کا نام حلف الفضول کیوں پڑا؟ مورخین واصحاب سیر نے اس کے مختلف اسباب بیان کیے ہیں:

(۱) اس طرح کا معاہدہ سب سے پہلے قبیلۂ جرہم وقطورا سے تعلق رکھنے والے مکہ کے اولین آبادکاروں نے کیا تھا۔ مورخین نے ان کی تعداد تین بیان کی ہے لیکن ان کے ناموں میں اختلاف ہے۔

ابن کثیر، ابن قتیبہ، ابن الاثیر صاحب النہایہ: الفضل بن الحارث۔ الفضل بن وداعۃ الفضل بن فضالۃ۔

ابن الاثیر صاحب الکامل: الفضیل بن الحرث الجرہمی، الفضیل بن وداعۃ القطوری المفضل بن فضالۃ الجرہمی۔

ابن کثیر، سہیلی، ابن الجوزی: الفضیل بن قضاعۃ (قزاعۃ) الفضل بن شزاعۃ۔ الفضل بن بضاعۃ۔

سہیلی، زبیر: فضیل بن شزاعۃ۔ فضل بن وداعۃ۔ فضل بن قضاعۃ

دیاربکری: الفضیل بن قضاعۃ۔ الفضیل بن شزاعۃ۔ الفضل بن بضاعۃ

ابن حجر: فضل۔ فضالۃ۔ مفضل۔

بعض مورخین نے کچھ اور نام بھی بیان کیے ہیں۔ بہرحال ان کے نام کچھ بھی ہوں۔ چونکہ ہر ایک کے نام میں "فضل" کا مادہ شامل ہے اس لیے ان کے کیے گئے معاہدہ کو حلف الفضول کا نام دیا گیا تھا۔ جب "مطیبین" نے بھی اسی طرح کا معاہدہ کیا تو انھوں نے کہا: "حلفٌ کحلف الفضول" یعنی ہم بھی اسی طرح کا معاہدہ کرتے ہیں جس طرح "فضول" نے معاہدہ کیا تھا۔ اس طرح ان کے کیے گئے معاہدے کو بھی

حلف الفضول کہا جانے لگا۔[۳۳]

(۲) انھوں نے یہ معاہدہ کیا تھا کہ جو فضل کسی صاحبِ حق سے کوئی ظالم چھینے گا، اسے وہ واپس دلا کر رہیں گے۔ اسی وجہ سے ان کا معاہدہ حلف الفضول کہلایا۔ منمق کی ایک روایت میں ہے:

| | |
|---|---|
| سمّی حلف الفضول | اس معاہدہ کا نام حلف الفضول |
| لانھم تحالفوا الا یترکوا | اس لیے پڑا کیوں کہ انھوں نے حلف |
| عند احد فضلا یظلمہ | اٹھایا تھا کہ اگر کوئی شخص ظلم و زیادتی کر |
| احد الّا اخذوہ منہ[۳۴] | کے کسی کا فضل چھینے گا تو اس سے |
| | چھین کر صاحبِ حق کو واپس دلائیں گے۔ |

ابن کثیر نے حمیدی سے ایک مرفوع روایت نقل کی ہے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں۔

| | |
|---|---|
| تحالفوا ان یردّوا | انھوں نے حلف اٹھایا تھا کہ |
| الفضول علی اھلھا[۳۵] | فضل کو اس کے حق داروں کی طرف |
| | پلٹائیں گے۔ |

سہیلی نے اس قول کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے کہ اگرچہ جرہم والی وجہ تسمیہ بھی مناسب ہے لیکن چونکہ یہ وجہ تسمیہ ایک مرفوع حدیث سے معلوم ہوتی ہے اس لیے یہ زیادہ قوی اور قابلِ قبول ہے۔[۳۶]

(۳) ایسے زمانے میں جب کہ لوگ اپنے اپنے قبائل اور خاندانوں کی عصبیتوں میں گرفتار تھے، ان لوگوں نے قبائل سے اوپر اٹھ کر اور ان کے دائرے سے باہر نکل کر یہ معاہدہ کیا، اسی لیے ان کے معاہدے کو حلف الفضول کا نام دیا گیا:

| | |
|---|---|
| وانما سمی حلف الفضول | اس معاہدے کا نام حلف الفضول |
| لانہ حلف خرج من حلف | پڑا اس لیے کہ وہ مطیبین اور احلاف |
| المطیّبین والاحلاف، فکان | دونوں کے معاہدوں سے الگ اور |
| فضلًا بینھما علیھا[۳۷] | ان سے مختلف نوعیت کا تھا۔ |

(۴) قریش کے جو قبائل اس معاہدے میں شریک نہیں ہوئے تھے انھوں نے

اس کا مذاق اڑایا، اسے فضول قرار دیا اور کہا کہ ان لوگوں نے اپنے دائرہ اختیار سے باہر جا کر کام کیا، بعد میں ان کا یہی دیا ہوا نام چل پڑا۔

| | |
|---|---|
| فسمّت قریش ذالک الحلف | قریش نے اس معاہدہ کو حلف |
| حلف الفضول وقالوا لقد | الفضول کا نام دیا اور کہا کہ ان لوگوں |
| دخل هولاء فی فضل من الامر[۳۸] | نے ضرورت سے زائد ایک کام کیا۔ |
| سمّوہ حلف الفضول | انھوں نے اس معاہدہ کا نام حلف |
| عیبًا له وقالوا هٰذا من | الفضول بطور عیب رکھا اور کہا کہ یہ |
| فضول القوم[۳۹] | ان لوگوں کا ایک بے فائدہ کام ہے۔ |

(۵) ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ ان لوگوں نے اس معاہدہ کے انعقاد کے لیے اپنا مال بھی خرچ کیا تھا۔ اس لیے یہ نام پڑا۔

| | |
|---|---|
| وقیل لانهم ای هولاء | ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ |
| الّذین تحالفوا کانوا | حلف اٹھانے والے ان لوگوں |
| اخرجوا فضول اموالهم | نے مہمانوں کے لیے اپنا مال خرچ |
| للاضیاف[۴۰] | کیا تھا، اس لیے یہ نام پڑا۔ |

## دفعات

اس معاہدے کی دفعات کے بارے میں کتبِ سیر و تاریخ میں کہیں اجمال ہے تو کہیں تفصیل۔ ابن ہشام اور ابن اثیر (م ۶۳۰ء) نے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

| | |
|---|---|
| تحالفوا وتعاقدوا | انھوں نے حلف دے کر عہد |
| ان لا یجد وا بمکة مظلومًا | کیا تھا کہ شہر مکہ میں کسی پر بھی ظلم ہو، |
| من اهلها اومن غیرهم من | خواہ وہ مکہ کا رہنے والا ہو یا کہیں باہر |
| سائر الناس الا قاموا معه | کا ہو تو وہ سب مظلوم کی تائید و |
| وکانوا علی من ظلمه حتی | مدافعت میں اور ظالم کے خلاف |
| ترد علیه فظلمته[۴۱] | اٹھ کھڑے ہوں گے یہاں تک کہ مظلوم |
| | کو اس کا حق واپس مل جائے۔ |

کتاب المنمق کی ایک روایت میں یہ اضافہ ہے: "شریفٌ اووضیعٌ، منا او من غیرنا"[۴۲] یعنی مظلوم خواہ شریف ہو یا وضیع (کم تر درجہ کا) ہم میں سے ہو یا کہیں اور کا؛ ہم ہر حال میں اس کا ساتھ دیں گے۔

کتاب الاغانی کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: "غریب ولا قریب، ولا حرّ ولا عبد"[۴۳] یعنی خواہ وہ پردیسی ہو یا مقامی، آزاد ہو یا غلام۔

ابن کثیر نے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

| | |
|---|---|
| تعاقدوا وتعاهدوا | انھوں نے باہم عہد و پیمان کیا کہ |
| بالله لیکونن یدًا | اللہ کی قسم ہم سب ظالم کے خلاف |
| واحدة مع المظلوم | مظلوم کی حمایت میں ایک ہاتھ بن |
| علی الظالم حتی | کر اٹھیں گے۔ یہاں تک کہ مظلوم کو |
| یودّی الیه حقه، مابلّ | اس کا حق مل جائے۔ ہمارا یہ عہد |
| بحر صوفة وما رسا | اس وقت تک باقی رہے جب تک |
| ثبیر وحراء مکانهما[۴۴] | سمندر گھونگھوں کو بھگوتا رہے اور |
| | ثبیر اور حرا نامی پہاڑ اپنی جگہ قائم رہیں۔ |

معاہدہ کے آخری جزو کا مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی وقتی اور عارضی معاہدہ نہیں ہے بلکہ ہمیشہ کے لیے ہے۔[۴۵]

منمق کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہے:

| | |
|---|---|
| لا ننقض هذا | ہم اس حلف کی خلاف ورزی |
| الحلف مابلّ بحر | نہ کریں گے جب تک سمندر گھونگھے |
| صوفة[۴۶] | کو بھگوتا رہے۔ |

کتاب الاغانی کی ایک روایت میں ہے کہ اس معاہدہ کی ایک دفعہ یہ بھی تھی۔

| | |
|---|---|
| وعلی الأمر بالمعروف | ہم اس بات کا بھی عہد کرتے |
| والنهی عن المنکر[۴۷] | ہیں کہ معروف کا حکم دیں گے اور |
| | منکر سے روکیں گے۔ |

ابن سعد (م ۲۳۰ھ) بغدادی، سہیلی اور ابن کثیر نے معاہدہ کی ایک دفعہ یہ

بھی نقل کی ہے :

| | |
|---|---|
| وعلی التأسی فی | اور اس بات پر عہد کرتے ہیں کہ |
| المعاش [۴۸] | ہم سب باہم مالی اعانت کریں گے۔ |

اس دفعہ کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی موقع پر مالی تعاون کا ضرورت مند ہو تو سب مل کر اس کی مدد کریں گے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اس دفعہ کے بارے میں لکھا ہے :

"اس کا آخری فقرہ بھی غور طلب ہے۔ مورخ ساکت ہے ہیں کہ اس کا منشا کیا تھا؟ بہرحال یہ تو یقین ہے کہ مدد کو جانے والے جب اپنی جان سے حاضر تھے تو اپنے مال کی کیا پروا کرتے ہوں گے۔"[۴۹]

## اثرات

تمام مورخین اور اصحاب سیر نے لکھا ہے کہ اس معاہدہ کا حلف لینے کے بعد حلف لینے والے عاص بن وائل کے پاس گئے اور اسے دھمکاتے ہوئے کہا کہ جب تک تم اس زبیدی تاجر کا مال اسے واپس نہیں کرو گے ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ بالآخر اسے مال واپس ہی کرتے بنی۔ منمق میں ہے کہ اس کے بعد حال یہ ہو گیا تھا کہ مکہ میں اگر کسی شخص پر ظلم ہوتا تھا تو یہ لوگ اس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے تھے (فمکثوا کذالک لایظلم احد بمکۃ الا اخذوا لہ)[۵۰] مورخین نے ایسے متعدد واقعات بیان کیے ہیں۔ جب کسی پر ظلم ہوا اور اس نے حلف الفضول کی دہائی دی تو فوراً اس کی حمایت میں لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کا حق واپس دلایا :

(۱) قبیلۂ شمالہ کا ایک شخص جس کا نام لیس بن سعد البارقی تھا، ازد سے سامانِ تجارت لے کر مکہ آیا۔ ابی بن خلف جمحی نے اس کا سامان خرید لیا لیکن قیمت ادا کرنے میں ٹال مٹول سے کام لیا۔ شمالی نے تقاضا کیا تو الٹا اسے برا بھلا کہا۔ اس نے اپنی رقم حاصل کرنے کے سلسلے میں بعض لوگوں سے مدد چاہی لیکن کوئی اس کی مدد کرنے کو تیار نہ ہوا۔ کسی نے ہمدردی میں اس سے کہا کہ حلف الفضول

والوں کے پاس جاؤ، وہ تمہاری مدد کریں گے۔ وہ ان لوگوں کے پاس گیا تو انھوں نے کہا: "ابیؓ کے پاس جا کر کہو کہ حلف الفضول والوں نے بھیجا ہے، پھر بھی اگر وہ تمہارے سامان کی قیمت نہ دے تو ہمارے پاس واپس آؤ۔" اصحابِ حلف الفضول کا نام سن کر ابیؓ نے فوراً اس کی قیمت ادا کر دی۔[۱۵۱]

(۲) قبیلۂ خثعم کا ایک شخص مکہ حج یا عمرہ کرنے کے ارادے سے آیا۔ اس کے ساتھ اس کی بیٹی بھی تھی جو بہت خوبصورت تھی۔ نبیہ بن الحجاج سہمی[۱۵۲] جو قریش کے مشہور شہسواروں میں سے تھا اس سے زبردستی اس کی بیٹی چھین کر اپنے گھر لے گیا۔ باپ نے بنو سہم کے پاس فریاد کی، مگر انھوں نے اس کی کچھ مدد نہ کی، وہ قریش کے دوسرے قبائل کے پاس گیا مگر انھوں نے بھی اس کی کچھ مدد کرنے سے انکار کیا۔ کسی نے کہا کہ حلف الفضول والوں کے پاس چلے جاؤ۔ اس نے کعبہ کے پاس کھڑے ہو کر آواز لگائی: "اے حلف الفضول والو!" فوراً چاروں طرف سے لوگ تلواریں سونتے ہوئے نکل آئے اور کہنے لگے: "کیا بات ہے؟ ہم مدد کے لیے حاضر ہیں۔" اس نے اپنی بپتا سنائی۔ فوراً وہ لوگ اس کے ساتھ گئے اور بیٹی برآمد کرا دی۔[۱۵۳]

(۳) حضرت معاویہؓ کے بھتیجے اور مدینہ کے گورنر ولید بن عتبہ اور حضرت حسین بن علیؓ کے درمیان ایک جائیداد کے سلسلے میں جھگڑا ہو گیا، اس موقع سے حضرت حسین نے دھمکی دی کہ اگر انھیں انصاف نہ ملا تو وہ حلف الفضول کی دہائی دیں گے۔ فوراً عبداللہ بن زبیر ہاشمی، مسور بن مخرمہ زہری، اور عبدالرحمٰن بن عثمان تیمی نے تائید کی اور اس پکار پر لبیک کہنے کا عندیہ ظاہر کیا، یہ دیکھ کر ولید بن عقبہ نے ان کا حق دے دیا۔[۱۵۴]

## خاتمہ

خلافتِ بنو امیہ کے آغاز تک حلف الفضول کا تذکرہ ملتا ہے، اس کے بعد اس کا سراغ نہیں ملتا۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے لکھا ہے:

"اس حلف کی خامی یہ تھی کہ نئے لوگ اس میں بھرتی نہیں ہوتے

تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ خلافتِ بنوامیہ کے آغاز پر جب اس کے شرکا میں سے آخری شریک انتقال کر گیا تو یہ ادارہ بھی ستّر اسّی سال کی شاندار روایتیں چھوڑ کر ختم ہو گیا۔" [۵۵]

"اسے مستقل ادارہ بنانے اور وقت بوقت نئے ارکان کو بھرتی کرنے کی جانب توجہ نہیں کی گئی جس کے باعث ایک ہی نسل کے بعد یہ انجمن ختم ہو گئی۔" [۵۶]

یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی اس لیے کہ حضرت حسین اور ولید بن عتبہ کے درمیان نزاع کے موقع پر جن لوگوں نے حلف الفضول کے نام پر حضرت حسین کا ساتھ دینے کا عندیہ ظاہر کیا تھا وہ بذاتِ خود حلف الفضول میں شریک نہیں تھے، بلکہ محض حلف الفضول میں شریک قبیلوں سے تعلق رکھنے کی وجہ سے انھوں نے اپنی حمایت ظاہر کی تھی۔

اس کے بجائے ڈاکٹر محمد حمید اللہ ہی کی دوسری بات قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔

"یہ ممکن تھا کہ حلف الفضول کا ادارہ ترقی کر کے ایک مستقل نظام کی حیثیت اختیار کر لیتا۔ لیکن جلد ہی اسلام کا زمانہ آ گیا جس کے بعد یہ ادارہ غیر ضروری ہو گیا، کیونکہ اسلامی حکومت نے ایک نہایت منظم مرکزی نظامِ عدالت قائم کر لیا اور خود عہدِ نبوی میں پورا جزیرہ نمائے عرب اور جنوبی فلسطین اسی مرکزی نظامِ عدالت کے تحت آ چکے تھے۔" [۵۷]

## عصری معنویت

حافظ ابن کثیر نے حمیدی کے حوالے سے حضرت ابوبکرؓ کے صاحب زادوں محمد اور عبدالرحمٰن سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لقد شهدت في دار عبد الله بن جدعان — میں عبداللہ بن جدعان کے گھر
میں ایک ایسے معاہدے میں شریک ہوا

حلفاً لو دُعیت بہ فی الاسلام لأجبت [۵۸]ہ — ہوں کہ اگر مجھے اس کا نام لے کر بلایا جائے تو میں اس پر لبیک کہوں گا۔

ابن ہشام، ابن سعد، بغدادی، ابن اثیر صاحب الکامل، ابن حجر اور دیار بکری وغیرہ نے بھی یہ روایت نقل کی ہے [۵۹]ہ سہیلی اور حلبی نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے:

یرید لو قال قائل من المظلومین یا لحلف الفضول لأجبت [۶۰]ہ — آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مظلوم حلف الفضول کی دہائی دے تو میں اس کی مدد کو ضرور پہنچوں گا۔

یہی مفہوم ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے ترجمے سے بھی نکلتا ہے:

"اگر اب زمانۂ اسلام میں بھی مجھے کوئی اس کی دہائی دے کر پکارے تو اس کی مدد کو دوڑوں"۔ [۶۱]ہ

جبکہ علامہ شبلی نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے:

"آج بھی ایسے معاہدے کے لیے کوئی بلائے تو میں حاضر ہوں"۔ [۶۲]ہ

مولانا مودودی (م ۱۹۷۹ء) کا ترجمہ بھی اسی سے ملتا جلتا ہے:

"اگر آج دورِ اسلام میں بھی ایسے کسی معاہدے کی طرف دعوت دی جائے تو میں اسے قبول کروں گا"۔ [۶۳]ہ

یہاں ایک سوال یہ ذہن میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلف الفضول کے بارے میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، اس کے سلسلے میں کلماتِ تحسین ادا فرمائے اور اس میں اپنی شرکت پر فخر جتایا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "اگر آج زمانۂ اسلام میں بھی کوئی ایسے معاہدے میں شرکت کے لیے دعوت دے تو اس کی دعوت کو قبول کروں گا" تو آپ نے خود سبقت کر کے ایسے کسی معاہدے کو تشکیل دینے اور دوسروں کو اس میں شریک کرنے کی کوشش کیوں نہیں فرمائی؟

اس کا سبب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اسلام نے ایک طرف مختلف عصبیتوں کو ختم کیا ہے اور تمام انسانوں کو مختلف وابستگیوں سے اوپر اٹھ کر اسلام کے نام پر یکجا ہونے کی تعلیم دی ہے۔ دوسری طرف تمام انسانوں کو بنیادی حقوق سے بہرہ ور

کیا ہے اور کسی بھی حق کے تلف ہونے کی صورت میں دادرسی اور حصولِ انصاف کا حق دیا ہے۔ اس معاملہ میں اس کی نظر میں امیر و غریب، آقا و خادم، حاکم و رعیت اور اعلیٰ و ادنیٰ کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ اس کی صرف نظری تعلیم نہیں ہے، بلکہ دنیا نے عملاً اس کا مشاہدہ کیا ہے کہ حق تلفی کی صورت میں اسلامی ریاست کے عام شہری نے حکمرانِ وقت کے خلاف عدالت میں اپنا مقدمہ دائر کیا ہے اور انصاف پایا ہے۔ حلف الفضول جیسا معاہدہ جن بنیادی حقوق کو تحفظ فراہم کرتا تھا ان سے کہیں زیادہ وسیع پیمانے پر اسلام انسانوں کے بنیادی حقوق کی ضمانت دیتا ہے اور ان کے تحفظ کے لیے اسلامی ریاست کو پابند کرتا ہے۔ اس لیے اسلام کے نفاذ اور اسلامی ریاست کے قیام و استحکام کے بعد اس معاہدے کے احیاء یا اس جیسے کسی دوسرے معاہدے کی تشکیل کی ضرورت نہ تھی، لیکن چونکہ حلف الفضول ایک اچھے کام کے لیے وجود میں آیا تھا، ایسا کام جس کا اسلام بھی داعی ہے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تائید و توثیق فرمائی اور اس میں شامل رہنے اور اسے نافذ کرنے کا اظہار فرمایا۔

حضرت جبیر بن مطعمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

| | |
|---|---|
| لاحلف فی الاسلام | اسلام میں کوئی معاہدہ نہیں، رہا |
| وایما حلف کان فی الجاھلیۃ | جاہلیت میں کیا گیا معاہدہ تو اسلام |
| لم یزدہ الاسلام الاشدۃ[۶۵] | اسے تقویت ہی دیتا ہے۔ |

یہی حدیث مسند احمد میں عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے مروی ہے[۶۵]۔

مسند احمد میں اسی سند سے ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

| | |
|---|---|
| واوفوا بحلف الجاھلیۃ | جاہلیت میں کیے گئے معاہدہ |
| فان الاسلام لم یزدہ | کو پورا کرو اس لیے کہ اسلام اسے |
| الاشدۃ، ولا تحدثوا | تقویت دیتا ہے، البتہ اسلام میں |
| حلفا فی الاسلام[۶۶] | ایسا کوئی معاہدہ نہ کرو۔ |

مذکورہ بالا حدیث میں کوئی معاہدہ کرنے کی مطلق ممانعت نہیں ہے بلکہ اس طرح کا معاہدہ کرنے سے روکا گیا ہے جیسا عہدِ جاہلیت میں مختلف

قبائل جنگ وجدال، غارت گری اور ظلم وزیادتی کے کاموں میں بھی ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے لیے کیا کرتے تھے، رہے عہد جاہلیت کے ایسے معاہدے جو اچھے کاموں کی انجام دہی کے لیے کیے گئے ہوں تو اسلام نہ صرف ان کی توثیق کرتا ہے بلکہ ایسے معاہدے آئندہ بھی کرنے کی اجازت دیتا ہے۔[۶۷] حضرت انس بن مالکؓ کی درج ذیل وضاحت سے اس کا اشارہ ملتا ہے۔

حضرت عاصم الاحول کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالکؓ کے سامنے عرض کیا: کیا آپ کو معلوم ہے کہ نبیؐ نے ارشاد فرمایا ہے "لاحلف فی الاسلام" (اسلام میں کوئی معاہدہ نہیں ہے) انھوں نے فرمایا: خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے گھر میں قریش (یعنی مہاجرین) اور انصار کے درمیان (اخوت وبھائی چارے کا) معاہدہ کرایا تھا۔[۶۸]

ایسے معاشروں میں جہاں اسلام کو قوتِ نافذہ حاصل اور اس کا نظام عدل پوری طرح قائم ہو، حلف الفضول جیسے معاہدے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ اسلام از خود وہ تحفظات فراہم کرتا اور حکمرانوں کو ظالموں کی سرکوبی کرنے اور مظلوموں کی دادرسی کرنے کا پابند کرتا ہے۔ لیکن جن معاشروں میں اسلام غالب ونافذ نہیں ہے، وہاں ظلم وزیادتی کی صورت میں حصولِ انصاف کو یقینی بنانے کے لیے ایسے معاہدوں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ ایسے ملکوں میں جہاں کا عدالتی نظام مضبوط بنیادوں پر قائم ہو اور جہاں ظلم وزیادتی کی صورت میں عدالتی چارہ جوئی کے ذریعہ انصاف حاصل کیا جاسکتا ہو، حلف الفضول جیسے معاہدے کی کیا معنویت رہ جاتی ہے؟ یہ بات پورے طور پر درست نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آج کے دور میں عدالتی چارہ جوئی انتہائی آسان ہوگئی ہے لیکن اس کے مصارف نہایت گراں بار اور ہوش ربا ہوتے ہیں، عموماً مظالم کا شکار سماجی اور معاشی لحاظ سے کمزور لوگ بنتے ہیں اور ان کے لیے ان مصارف کا برداشت کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ایسے میں اگر مختلف بستیوں اور علاقوں میں حلف الفضول جیسے معاہدے تشکیل دیے جائیں جن میں مختلف مذاہب، طبقات اور برادریوں کے سربرآوردہ لوگوں کو شریک کیا جائے تو ان سے مظالم کے خاتمے، حق تلفیوں کے ازالے، اخلاقی قدروں کے فروغ اور سماج سدھار میں بخوبی مدد

مل سکتی ہے۔

حلف الفضول کے بارے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویب و توثیق سے ایک بات یہ بھی مستنبط ہوتی ہے کہ کثیر مذاہب معاشروں میں مشترکہ امور کے سلسلہ میں دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ تعاون کیا جا سکتا ہے اور ایسی قدروں کے فروغ کے لیے، جن کا اسلام بھی علمبردار ہے، ان کے ساتھ مل کر کام کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اسلام کا زریں اصول تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدۃ - ۲) ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

# حواشی و مراجع

۱۔ ابن منظور، لسان العرب، دار صادر، بیروت ۱۵/ ۱۴۰ مادہ 'غوی'

۲۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، دار صادر بیروت ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۷ء جلد اول ص ۱۲۸، ابن حبیب بغدادی، کتاب المنمق فی اخبار قریش، تحقیق خورشید احمد فارق، دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد دکن، ۱۹۶۴ء ص ۲۱۸۔ ابن الجوزی، الوفا باحوال المصطفیٰ، دار الکتب الحدیثہ مصر ۱۹۶۶ء، جلد اول ص ۱۳۸، حسین بن محمد بن الحسن الدیار بکری، تاریخ الخمیس فی احوال انفس نفیس، المطبعۃ العامرۃ العثمانیہ ۱۳۰۲ھ، جلد اول ص ۲۹۵

۳۔ بغدادی ص ۴۵

۴۔ عبد الرحمٰن السہیلی۔ الروض الانف فی شرح السیرۃ النبویۃ لابن ہشام بتحقیق و تعلیق و شرح: عبد الرحمٰن وکیل، مطبع و سنہ طبع ندارد، جلد دوم ص ۷۲، ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، دار الریان للتراث مصر ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸ء طبع اول جلد دوم ص ۲۷۰

۵۔ بغدادی، المنمق، ص ۳۴۴

۶۔ بغدادی، المنمق ص ۲۱۸، علی بن الحسین المسعودی، مروج الذہب و معادن الجواہر، المطبعۃ البہیۃ المصریہ ۱۳۴۶ھ، ص ۳۹۶ - ۳۹۷، ابن الجوزی ۱/ ۱۳۸

۷۔ بغدادی، المنمق ص ۴۵

۸۔ سہیلی ۲/ ۷۲، ابن کثیر، ۲/ ۲۷۰

۹۔ ابن قتیبہ، المعارف، تحقیق ڈاکٹر ثروت عکاشہ، مطبعۃ دار الکتب قاہرہ، ۱۹۶۰ء،

ص ۶۰۴ ، ابن الجوزی ، ۱/ ۱۳۵ ، دیار بکری ۱/۲۹۵

۱۰ھ شبلی نعمانی ، سیرت النبی ، مطبع معارف اعظم گڑھ ، ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء ، جلد اول ص ۱۸۳، ۱۸۴

۱۱ھ محمد محی الدین عبدالحمید ، محقق سیرۃ النبی لابن ہشام ، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷م ص ۱۴۴ (حاشیہ)

۱۲ھ بغدادی نے ابن ابی ثابت کی سند سے ایک روایت نقل کی ہے اس میں حذیفہ بن قیس السہمی مذکور ہے۔ المنمق ص ۳۳۶

۱۳ھ محمد بن حبیب البغدادی ، کتاب المحبر ، دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد دکن ۱۳۶۱ھ ۱۹۴۲ء ، ص ۱۶۶ - ۱۶۷ ۔

۱۴ھ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے لکھا ہے : "غالباً اس دعوت میں احلاف کو بلایا بھی نہیں گیا تھا" اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ ، دانش گاہ پنجاب ، لاہور ، مقالہ "حلف الفضول" جلد ۱۵ ص ۵۱۳

۱۵ھ ابن سعد ۱/۱۲۸ ، مسعودی ۱/۳۹۶ ، ابن الجوزی ۱/۱۳۸ ، سہیلی ۲/۷۲ ، ابن کثیر ۲/۲۷۰ علی بن برہان الدین الحلبی ، انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون المعروف بالسیرۃ الحلبیۃ ، المطبعۃ العامرۃ مصر ۱۲۹۲ھ ، جلد اول ص ۱۷۲

۱۶ھ مسعودی ص ۳۹۶ - ۳۹۷

۱۷ھ جناب زبیر بن عبدالمطلب کے بارے میں تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی کا مقالہ "عم نبوی زبیر بن عبدالمطلب اور سیرت نبوی ۔ سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ جلد ۱۵ ، شمارہ ۳ ، جولائی ستمبر ۱۹۹۶ء ص ۲۷ - ۶۰

۱۸ھ بغدادی ، المحبر ۱۳۷ ، ۲۳۷ ، ۲۴۰ ، ابن قتیبہ ۱۷۵ ، ۲۶۴ ، ابن کثیر ۲/۲۰۲ ، حلبی ۱/۱۷۲

۱۹ھ صحیح مسلم ، کتاب الایمان ، باب الدلیل علی ان من مات علی الکفر لاینفعہ عمل ۔

۲۰ھ بغدادی ، المنمق ص ۲۰۳

۲۱ھ سہیلی ۲/۷۵

۲۲ھ محمد ادریس کاندھلوی ، سیرۃ المصطفیٰ ، النشار پریس لاہور ۱۳۷۵ھ ص ۷۷ ، ابوالاعلیٰ مودودی ، سیرت سرور عالم ۔ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی حصہ دوم ص ۱۱۱

۲۳ھ ابن کثیر ۲/۲۰۲

۲۴ھ ابن ہشام ۱/۱۴۵

۲۵ محمد حمید اللہ۔ اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ ۸/۵۱۳

۲۶ بغدادی، المنمق ص ۲۲۱

۲۷ مسند احمد، تحقیق احمد محمد شاکر، دار المعارف مصر، ۱۹۵۰ء حدیث نمبر ۱۶۵۵، ۳/۱۲۱-۱۲۲
حدیث نمبر ۱۶۷۶، ۳/۱۳۶

۲۸ احمد محمد شاکر، حوالہ سابق

۲۹ ابن حجر، فتح الباری بشرح صحیح البخاری، دار المعرفۃ بیروت، جلد ۱۰، ص ۵۰۲

۳۰ ابن کثیر ۲/۲۷۰

۳۱ ابن کثیر ۲/۲۷۰، حلبی ۱/۱۷۴

۳۲ بغدادی، المنمق ص ۴۵

۳۳ سہیلی ۲/۷۰، ابن الجوزی ۱/۱۳۷، ابن الاثیر (م ۶۰۲ھ) النہایہ فی غریب الحدیث، المطبعۃ العثمانیہ مصر ۱۳۱۱ھ جلد ۳، ص ۲۰۵-۲۰۶، مادۂ 'فضل'، ابن الاثیر (م ۶۳۰ھ) الکامل فی التاریخ، دار الکتاب العربی بیروت ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء طبع ۶، جلد دوم ص ۲۵-۲۶، ابن کثیر ۲/۲۷۱، ابن حجر ۴/۴۷۳، دیار بکری ۱/۲۹۵۔ حلبی ۱/۱۷۶

۳۴ بغدادی، المنمق ص ۳۴۱

۳۵ ابن کثیر ۲/۲۷۰، مزید ملاحظہ کیجئے حلبی ۱/۱۷۴

۳۶ سہیلی ۲/۷۱

۳۷ بغدادی، المنمق ص ۴۷، ۳۴۱

۳۸ سہیلی ۲/۷۳، ابن کثیر ۲/۱۷۱

۳۹ ابن الجوزی ۱/۱۳۷، مزید دیکھئے ابن ہشام ۱/۱۴۵، ابن سعد ۱/۱۲۹، حلبی ۱/۱۷۶، دیار بکری ۱/۲۹۵، محمد حمید اللہ اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ ۸/۵۱۴

۴۰ حلبی ۱/۱۷۶ ۴۱ ابن ہشام ۱/۱۴۵، ابن اثیر صاحب الکامل ۲/۲۶

۴۲ بغدادی المنمق ص ۴۵

۴۳ ابو الفرج اصفہانی، کتاب الاغانی تحقیق عبد الستار احمد فراج، دار الثقافۃ بیروت ۱۹۵۹ء جلد ۱۶ ص ۲۱۲

۴۴ ابن کثیر ۲/۲۷۱، ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے صوفۃ کا ترجمہ ایک جگہ "گھونگھا" کیا ہے (رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی دار الاشاعت کراچی ص ۶۶) اور دوسری جگہ اسفنج (اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ مقالہ حلف الفضول ۸/۵۱۴)

۴۵ھ حلبی ۱/۱۷۴ ۴۶ھ بغدادی، المنمق ص ۲۲۱ ۴۷ھ اصفہانی ۱۷/۲۱۳
۴۸ھ ابن سعد ۱/۱۲۹، بغدادی المنمق ص ۳۴۱، سہیلی ۲/۷۳، ابن کثیر ۲/۲۷۱
۴۹ھ محمد حمید اللہ، رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی ص ۶۶
۵۰ھ بغدادی، المنمق ص ۴۷
۵۱ھ بغدادی، حوالہ سابق ص ۴۸، ۳۴۳
۵۲ھ نبیہ بن الحجاج سہمی غزوۂ بدر میں مشرکین کے لشکر میں تھا اور قتل کیا گیا تھا۔ اس کا شمار جاہلیت کے مشہور شعرا میں ہوتا ہے۔ اس کا مفصل تذکرہ ابوالفرج اصفہانی نے کتاب الاغانی میں کیا ہے، ۱۷/۲۰۴-۲۰۹
۵۳ھ بغدادی، المنمق ۴۸-۴۹، اصفہانی ۱۷/۲۰۷، سہیلی ۲/۷۳، ابن کثیر ۲/۲۷۱، حلبی ۱/۱۷۶
۵۴ھ ابن ہشام ۱/۱۴۶، سہیلی ۲/۸۱، ابن اثیر صاحب الکامل ۲/۲۶-۲۷، حلبی ۱/۱۷۶-۱۷۷
۵۵ھ محمد حمید اللہ، اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ ۸/۵۱۴
۵۶ھ محمد حمید اللہ، رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی ص ۶۶
۵۷ھ محمد حمید اللہ، عہد نبوی میں نظام حکمرانی، اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی ۱۹۹۶ء ص ۶۵
۵۸ھ ابن کثیر ۲/۲۷۰
۵۹ھ ابن ہشام ۱/۴۶، ابن سعد ۱/۱۲۹، بغدادی، المنمق ص ۲۲۰، ۳۴۱، ۳۴۴، ابن اثیر صاحب الکامل ۲/۲۶، ابن حجر ۴/۴۷۳، دیار بکری ۱/۲۹۵
۶۰ھ سہیلی ۲/۸۲، حلبی ۱/۱۷۴
۶۱ھ محمد حمید اللہ، رسول اکرم کی سیاسی زندگی ص ۶۶، عہد نبوی میں نظام حکمرانی ص ۱۴۵ (حاشیہ)
۶۲ھ شبلی ۱/۱۸۳
۶۳ھ مودودی، ۲/۱۱۱، اسی سیاق میں مولانا مودودی نے دوسری جگہ یہ ترجمہ کیا ہے "ایسے معاہدہ میں شرکت کی اگر مجھے اسلام کے زمانے میں دعوت دی جائے تو میں اسے پسند کروں گا" (۲/۱۱۰) یہاں مولانا نے عربی متن میں لفظ "اجبت" (ا ج ب ت) کو "احببت" (ا ح ب ب ت) پڑھ کر اس کے اعتبار سے ترجمہ کر دیا ہے۔
۶۴ھ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب مواخاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بین اصحابہ، حدیث نمبر ۲۵۳۰، سنن ابی داؤد، کتاب الفرائض، باب فی الحلف ۶۵ھ مسند احمد تحقیق احمد محمد شاکر ۱۱/۱۸۷-۱۸۸، حدیث نمبر ۷۰۱۲
۶۶ھ مسند احمد ۱۱/۱۷۴، حدیث نمبر ۶۹۹۲ ۶۷ھ ابن حجر، ۱۰/۵۰۲
۶۸ھ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الاخاء والحلف، سنن ابی داؤد، کتاب الفرائض، باب فی الحلف۔

## بحث ونظر

# دلائلِ ربوبیت اور خلافتِ ارض

## سورۂ نور کے بعض حیرت انگیز حقائق

مولانا محمد شہاب الدین ندوی مرحوم

مولانا محمد شہاب الدین ندوی کا یہ مضمون ان کی حیات کے آخری دنوں میں موصول ہوا۔ افسوس کہ اس کی اشاعت سے پہلے ہی وہ اس دارفانی سے رخصت ہو گئے۔ مولانا شہاب الدین ندوی مرحوم نے جدید علوم وافکار اور خاص طور پر سائنسی تحقیقات کا قرآن مجید کی روشنی میں تفصیل سے مطالعہ کیا تھا۔ ان کی تحقیقات مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے بنگلور میں فرقانیہ اکیڈیمی قائم کی تھی۔ اس کے ذریعہ بڑی تعداد میں علمی مطبوعات سامنے آئیں۔ خدا کرے کہ ان کے صاحب زادوں کے ذریعہ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے۔ مرحوم کو اس عاجز سے تعلقِ خاطر تھا اور محبت فرماتے تھے۔ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں جگہ دے۔ (جلال الدین)

### قرآن میں ہر مسئلے کا حل موجود

قرآنِ عظیم ہمارے تمام شرعی وفکری، تہذیبی وتمدنی اور ہر قسم کے اجتماعی مسائل کا مرجع اور خدائی منشور ہے۔ اسی بنا پر ہمارے کسی بھی قضیے اور تنازعے کے تصفیے کے لیے اس کی طرف رجوع کرنا شرعاً واجب ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید ہمارے دینی ودنیوی ہر مسئلے کا حل پیش کرنے والی ایک بے مثال کتاب ہے اور وہ ہر دور، ہر علم وفن اور ہر قسم کے حالات میں اہلِ اسلام کی بخوبی رہنمائی کر سکتی ہے، خواہ زمانہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لے۔ اسی بنا پر ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا | تو کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا |
| وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ | حکم مان لوں، حالانکہ اُسی نے تمہارے |
| الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (انعام: ۱۱۴) | پاس یہ کتاب تفصیل کے ساتھ بھیج دی ہے؟ |

اس موقع پر کتابِ الٰہی کی ایک صفت اور خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ ایک "مُفصّل" کتاب ہے یعنی ہر چیز اور ہر مسئلے کی "تفصیل" بیان کرنے والی، چاہے اُس کا موضوع کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اُس کی اس ابدی خصوصیت پر دوسرے مقامات پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے:

| | |
|---|---|
| كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ | یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں |
| قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ | صاف صاف بیان کی گئی ہیں۔ یعنی |
| (حٰمٓ سجدہ: ۳) | ایسا قرآن جو عربی زبان میں ہے ایسے |
| | لوگوں کے لیے نافع ہے جو علم رکھتے ہیں۔ |

مطلب یہ کہ یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں (اور اس بنا پر) وہ اہلِ علم کے لیے بالکل واضح ہیں اس کی کوئی بات پیچیدہ نہیں ہے یہی بات دوسرے مقام پر اس طرح کہی گئی ہے۔

| | |
|---|---|
| وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ | اور ہم نے ہر چیز کی خوب تفصیل |
| تَفْصِيْلًا (بنی اسرائیل: ۱۲) | کر دی ہے۔ |

اس موقع پر ہر چیز کی تفصیل سے مراد ہر علم و فن اور ہر قضیہ و مسئلہ کا حل ہے، جو باریٔ تعالیٰ کی جانب سے بطورِ ہدایت و رہنمائی مرقوم ہے، تاکہ اہلِ اسلام کسی بھی مسئلے میں حیران و پریشان نہ ہوں

| | |
|---|---|
| وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا | ہم نے یقیناً اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر |
| الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ | قسم کی مثال بیان کر دی ہے، تاکہ وہ نصیحت |
| يَتَذَكَّرُوْنَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ | حاصل کریں۔ اس کا حال یہ ہے کہ وہ قرآن |
| عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ (زمر: ۲۷-۲۸) | عربی ہے جس میں کوئی کجی نہیں ہے تاکہ یہ لوگ اس سے ڈریں۔ |

اسی بنا پر کلامِ الٰہی کو اہلِ اسلام کے لیے ہدایت، رحمت اور خوشخبری کا باعث قرار دیا گیا ہے، کیونکہ وہ جدید سے جدید ہر مسئلے اور ہر قضیے کا حل پیش کرتا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ | اور ہم نے آپ پر وہ کتاب نازل کر دی |

تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (نحل: ۸۹)

ہے جو ہر چیز کی خوب وضاحت کرنے والی ہے اور (اس بنا پر) وہ اہل اسلام کے لیے ہدایت، رحمت اور خوشخبری ہے۔

وَلَقَدْ جِئْنَاهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (اعراف: ۵۲)

ہم نے یقیناً ان کے پاس ایک ایسی کتاب پہنچادی ہے جسے ہم نے (اپنے خصوصی) علم کی بنا پر مفصل بنادیا ہے، تاکہ وہ ایمان والوں کے لیے ہدایت و رحمت بن سکے۔

## اختلافی مسائل میں فیصلہ کرنے والی کتاب

چونکہ کتاب الٰہی ہر مسئلے کی حقیقت و نوعیت پر خوب روشنی ڈالنے والی ہے، لہٰذا کسی بھی شرعی و فقہی اور فکری و نظری مسئلے میں اگر امت کے درمیان اختلاف پیدا ہوجائے تو اس صورت میں کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنے اور اپنے باہمی اختلافات کو دور کرنے کا حکم دیتے ہوئے اسے ایمان کی علامت قرار دیا گیا ہے:

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (نساء: ۵۹)

اگر تم کسی بات میں باہم جھگڑ بیٹھو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗ اِلَى اللّٰهِ (شوریٰ: ۱۰)

اور جس مسئلے میں بھی تم اختلاف کر بیٹھو تو اس کا حکم اللہ کے ذمہ ہے۔

اس لحاظ سے کسی بھی متنازع فیہ مسئلے میں اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ ہوگا اور اس بارے میں ہما و شما کے "اقوال" سے استدلال کرتے ہوئے خدا اور اُس کے رسول کے فیصلوں کو رد کرنا یا ان میں شک و شبہ کرنا خدا اور یوم آخرت پر ایمان کے خلاف ہے۔ اسی لیے ارشاد باری ہے:

وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (مائدہ: ۵۰)

یقین رکھنے والوں کے لیے اللہ سے بہتر کس کا حکم ہوسکتا ہے؟

| | |
|---|---|
| اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ، | حکم صرف اللہ ہی کا ہے، وہ حق |
| يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ | بات بیان کرتا ہے اور سب سے بہتر فیصلہ |
| الْفَاصِلِيْنَ ۔ (انعام: ۵۷) | کرنے والا ہے۔ |

اسی لیے کتابِ الٰہی کو "حکم الٰہی" سے مزین اور پوری طرح لیس کر دیا گیا ہے، تاکہ وہ اہلِ ایمان کے باہمی اختلافات کے درمیان بہترین فیصلہ کر سکے۔

| | |
|---|---|
| وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا | اور اسی طرح ہم نے اس قرآن کو |
| عَرَبِيًّا ۔ (رعد: ۳۷) | واضح فیصلہ بنا کر اُتارا ہے۔ |
| اَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ اَسْرَعُ | آگاہ رہو! حکم کرنا اللہ ہی کا کام |
| الْحَاسِبِيْنَ ۔ (انعام: ۶۲) | ہے اور وہ بہت تیزی سے حساب لینے والا ہے۔ |

## اہلِ اسلام کا ایک بے بنیاد موقف

غرض یہ کہ قرآن عظیم تمام مسائلِ حیات کو حل کرنے اور اختلاف بین الناس کے درمیان محاکمہ کرنے والی ایک بے نظیر کتاب ہے، جس میں ہر مسئلے کا کافی وشافی جواب اُس کے ابدی حقائق و معارف کی روشنی میں مل جاتا ہے۔ لہٰذا ایک مومن و مسلم کے لیے کتابِ الٰہی کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ ہوگا اور اسے اپنے کسی بھی نظریہ اور کسی بھی موقف کے حق میں کتاب و سنت سے دلیل و حجت پیش کرنا ہوگا، خاص کر ان مسائل میں جو امت کے اجتماعی امور سے تعلق رکھتے ہوں۔ کیونکہ امت کے اجتماعی معاملات کا مسئلہ بڑا نازک ہے اور ان میں ذرا سی بھی چوک اور غفلت کی سزا صدیوں تک بھگتنی پڑتی ہے۔ لہٰذا امت کے اجتماعی اُمور و مسائل کے بارے میں اربابِ ملّت کو ہمیشہ باخبر رہنے اور کتاب و سنت کے نصوص اور اُس کے واضح احکام و ہدایات پر نظر رکھنے کی شدید ضرورت ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ آج کل اہلِ اسلام کا "ٹاپ طبقہ" جدید علوم و مسائل کے تعلق سے ایک غلط اور بے بنیاد موقف اختیار کر کے پوری امت کو پیچھے کی طرف دھکیل رہا ہے، جس کے نتیجے میں اسلام اور مسلمانوں کو خلافتِ ارض کے میدان میں سخت نقصان سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ میری مراد جدید سائنسی (تکوینی) علوم سے ہے، جو آج قوموں کے عروج و

زوال کی علامت بن گئے ہیں۔ چنانچہ آج جو قوم ان علوم سے لیس ہے وہ تمدنی وعسکری میدان میں برتری حاصل کرکے کمزور قوموں کو کچل رہی اور انھیں حاشیے پر دھکیل رہی ہے اور ان علوم کا ایک دوسرا میدان بھی ہے، جو دلیل واستدلال کا ہے اور یہ میدان اہلِ اسلام کے ساتھ مخصوص ہے جو ان علوم ومسائل میں مہارت حاصل کرکے عصرِ جدید میں اُن دلائلِ رُبوبیت کو منظرِ عام پر لاسکتے اور گمراہ لوگوں کی ہدایت کا سامان مہیا کرسکتے ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر قرآنِ عظیم میں سیکڑوں آیتیں موجود ہیں، جو اس سلسلے میں مختلف اسالیب میں مذکور ہیں۔ مگر آج اہلِ اسلام ان علوم ومسائل سے آگاہ ہوکر اپنا یہ شرعی فریضہ ادا کرنے کے بجائے ان مسائل سے کلّی طور پر اجتناب کرتے ہوئے ان پر طرح طرح کی پھبتیاں کستے اور انھیں ناقابلِ اعتبار قرار دے کر ان سے اپنا دامن جھاڑ رہے ہیں اور اہلِ اسلام کا یہ موقف شرعی وعقلی اعتبار سے تعجّب خیز ہی نہیں بلکہ قابلِ گرفت بھی ہے۔ کیونکہ اس سے نہ صرف شرعی اعتبار سے باریٔ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی اور قرآنی فیصلوں کی خلاف ورزی لازم آتی ہے بلکہ خود عقلی وعلمی اعتبار سے بھی یہ ایک غلط اور لایعنی موقف ہے۔

قصہ مختصر، آج اربابِ ملت کسی شرعی دلیل کی بنیاد پر نہیں، بلکہ محض ایک "عقلی احتمال" یا ایک شبہ کی بنا پر یہ موقف اختیار کیے ہوئے ہیں۔ حالانکہ انھیں اپنے اس موقف کی تائید میں قرآن اور حدیث سے کوئی دلیل یا سند پیش کرنی چاہیے تھی۔ سوال یہ ہے کہ محض اپنے ایک شبہ کی بنا پر کیا کوئی مسلمان احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوسکتا ہے اور باریٔ تعالیٰ کی سیکڑوں آیتوں کو جھٹلا سکتا ہے؟ یہ ہر ایک کے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔

## کتابِ ہدایت کی اصل نوعیت

اس سلسلے میں اہلِ اسلام کے دو بے دلیل دعوے ہیں جو یہ ہیں: (۱) قرآن مجید "کتابِ ہدایت" ہے، لہٰذا اسے علوم وفنون اور خصوصاً سائنسی علوم کے "تابع" قرار دینا بالکل غلط ہے (۲) سائنسی تحقیقات بدلتی رہتی ہیں لہٰذا ان پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں تک پہلے دعوے کا تعلق ہے وہ محض ایک ادعا ہے، جو خود قرآنی

تصریحات کے خلاف ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری کے مطابق قرآن دو حیثیتوں سے کتابِ ہدایت ہے۔ ایک یہ کہ وہ نوعِ انسانی کے لیے واضح دلائل ہونے کے لحاظ سے کتابِ ہدایت ہے، دیکھئے سورۂ بقرہ آیت ۱۸۵۔ یعنی نوعِ انسانی کی فکری و نظریاتی اعتبار سے رہنمائی کرنے اور اس کے غلط عقائد کی اصلاح کرنے کی غرض سے اس کی تشفی کا سامان فراہم کرنے کے لحاظ سے وہ کتابِ ہدایت ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر پچھلے صفحات میں دو آیتیں (نحل: ۸۹ اور اعراف: ۵۲) پیش کی جا چکی ہیں اور اب کچھ مزید آیات پیش کی جاتی ہیں۔

| | |
|---|---|
| هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَ هُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (آل عمران: ۱۳۸) | یہ تمام لوگوں کے لیے ایک وضاحت نامہ ہے اور (خاص کر) اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے ہدایت و رحمت کا باعث ہے۔ |
| مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (یوسف: ۱۱۱) | یہ ایسی بات نہیں ہے جو گھڑ کر پیش کی گئی ہو، بلکہ یہ اپنے سامنے والے (حقائق یا پچھلی کتابوں) کی تصدیق اور ہر چیز (ہر مسئلے) کی تفصیل ہے اور (اس بنا پر) وہ ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔ |
| يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (یونس: ۵۷) | اے لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے سمجھ داری کی بات اور دلوں کے روگ کے لیے (سامانِ) شفا آچکا ہے اور (اس بنا پر) وہ ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔ |

اس قسم کی اور بھی آیات موجود ہیں ان تمام آیات کے ملاحظے سے یہ ابدی حقیقت سامنے آتی ہے کہ باریٔ تعالیٰ کی نظر میں نوعِ انسانی کے ذہنی و فکری مسائل میں اُس کی صحیح رہنمائی کر کے اسے صراطِ مستقیم کی طرف لانا ہی اصل ہدایت ہے۔ اسی لیے اس میں ہر مشکل مسئلے کا کافی و شافی حل موجود ہے جو "دلوں کے روگ"

کے لیے باعثِ شفا ہے۔ اس سے بڑھ کر صاف وصریح آیات اور کیا ہو سکتی ہیں۔ اس لحاظ سے قرآنِ عظیم پوری نوعِ انسانی اور ہر دور کے علوم وفنون اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ہر قسم کے افکار ونظریات کے توڑ کے لیے اپنے ابدی صفحات میں "سامانِ شفا" سمیٹے ہوئے ہے، جسے منظرِ عام پر لانے کے لیے عصری علوم وفنون کا مطالعہ اور جائزہ ضروری ہے۔ اس نقطۂ نظر سے کلام الٰہی سارے جہان کے لیے ہدایت نامہ ہے اور اسی اعتبار سے وہ اہلِ اسلام کے لیے بھی ہدایت ورحمت ہی نہیں بلکہ "خوشخبری" کا بھی باعث ہے۔ یعنی نئے نئے علوم وفنون اور نئے نئے مسائل میں اُن کی رہنمائی کرتے ہوئے اُن کے پائے ثبات کو جمائے رکھنے والا۔ دیکھئے کلام الٰہی میں اس اصول کی وضاحت کس طرح کی گئی ہے۔

قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝ (نحل: ۱۰۲)

کہدو کہ اس (کتاب) کو روح القدس نے تمہارے رب کی طرف سے (پوری) حقانیت کے ساتھ اتارا ہے، تاکہ وہ اس کے ذریعے اہلِ ایمان کو ثابت قدم رکھ سکے اور وہ اہلِ اسلام کے لیے ہدایت اور خوشخبری بن سکے۔

طٰسٓ، تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (نمل: ۱-۲-۳)

طاسین، یہ قرآن کی آیات ہیں جو کتابِ روشن ہے۔ یہ (اپنے ابدی حقائق کی بنا پر) اہلِ ایمان کے لیے ہدایت اور خوشخبری ہے۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ۔ (جاثیہ: ۲۰)

یہ (قرآن) تمام لوگوں کے لیے عبرت کی باتوں پر مشتمل ہے اور یقین کرنے والوں کے لیے ہدایت ورحمت کا باعث ہے۔

## قرآن کے نظامِ دلائل سے اعراض

یہ ہے قرآنِ حکیم کے کتابِ ہدایت ہونے کی صحیح نوعیت، جوہر علم وفن اور

ہر قسم کے فکری و نظریاتی مسائل میں عالمِ انسانی کی صحیح رہنمائی کرنے اور اسے گمراہیوں سے باز رکھنے والا ہے۔ اس اعتبار سے وہ کتابِ دلائل اور کتابِ حکمت ہے۔ جہاں تک "سائنسی تحقیقات" میں تبدیلی کا سوال ہے تو یہ اعتراض درحقیقت سائنسی علوم سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ تبدیلی جو کچھ بھی ہوتی ہے وہ سائنسی تحقیقات میں نہیں بلکہ سائنس کے اُن "افکار" میں ہوتی ہے جو تجربات و مشاہدات پر مبنی نہیں بلکہ وہ قیاسی و مفروضاتی ہوں۔

مگر اس سلسلے میں سب سے بڑی عبرت کی بات یہ ہے کہ باریٔ تعالیٰ نے اپنی کتابِ حکمت میں کہیں بھی یہ نہیں فرمایا کہ انسانی یا سائنسی علوم تغیر پذیر اور ناقابلِ حجت ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس سیکڑوں آیتوں کے ذریعہ انسان کو نظامِ کائنات میں غوروخوض کرنے اور ان میں موجود دلائلِ رُبوبیت کو کھوج نکالنے کا حکم دیا ہے اور ان دلائل و براہین سے عبرت حاصل نہ کرنے والوں کو بہائم اور چوپائے تک قرار دیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سائنسی علوم خود خلاقِ عالم کی نظر میں معتبر اور قابلِ استدلال ہیں۔ اس بات کو جھٹلانا کلامِ الٰہی کی تکذیب کے برابر ہے۔ معاذ اللہ۔ ظاہر ہے کہ خداوندِ عالم کی بات سے زیادہ سچی اور معتبر بات اور کس کی ہوسکتی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ قرآن عظیم ہر قسم کے عقلی و منطقی اور علمی و سائنسی دلائل و براہین سے بھرا ہوا ہے، جو ہر دور میں اور ہر ذہن و فکر کے حامل لوگوں کے لیے درسِ عبرت کی حیثیت رکھتے اور غلط افکار و نظریات کے خاتمے اور خداپرستی کے احیار کی راہ میں نہایت درجہ مؤثر رول ادا کرسکتے ہیں اور یہ دلائل ہر علم و فن میں موجود ہیں۔ تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نہ تو قرآنِ عظیم کو حجت مانتے ہیں اور نہ سائنسی علوم و معارف کو؟ واضح رہے قرآنِ عظیم شروع سے آخر تک ایک "مکمل نظامِ دلائل" کا حامل ہے، جو اس کا ایک حیرت انگیز روپ اور زبردست معجزہ ہے اور اس حیثیت سے بھی وہ ایک "مکمل کتاب" ہے، جو سارے جہاں کو مبہوت و متحیر کرسکتی ہے۔ باریٔ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ سائنسی علوم کی ترقی اور ان کی ترویج و اشاعت کے باعث مادہ پرستانہ نظریات اور ملحدانہ فلسفوں کو عروج حاصل ہو جائے گا۔ لہٰذا اُس

نے اس الحادی ذہنیت کے توڑ کے لیے پہلے ہی سے اپنی کتابِ حکمت کو جدید سے جدید تر ہر قسم کے علمی و عقلی دلائل سے مُزین کر رکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اگر حاملینِ قرآن کتابِ الٰہی کے اس زبردست پہلو اور اُس کے نئے معجزے سے غافل اور بے پرواہیں تو اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہ صرف ملتِ اسلامیہ ہی کا نہیں بلکہ درحقیقت سارے عالمِ انسانی کا المیہ اور نقصانِ عظیم ہے۔ پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے، لہٰذا اب اربابِ ملت کو فوراً اور بلا تاخیر بیدار ہو کر اپنا شرعی فریضہ پھر سے ادا کرنے کے لیے پوری طرح کمربستہ ہو جانا چاہیے۔ ہم قرآنِ عظیم کے نظامِ دلائل سے اعراض کر کے عصرِ جدید میں نہ تو اسے کتابِ ہدایت ثابت کر سکتے ہیں اور نہ نوعِ انسانی کو راہ راست دکھا سکتے ہیں۔

## اللہ کی ایک ازلی سنّت

چونکہ سنتِ الٰہی کے مطابق ہر دور میں نوعِ انسانی کی توجہ مبذول کرانے کی غرض سے ایک "معجزے" کی ضرورت پڑتی ہے، اور بغیر معجزے کے کوئی بھی قوم ایمان نہیں لاتی، اسی لیے باریٔ تعالیٰ اپنے ہر رسول کو کوئی نہ کوئی معجزہ بطور "نشانِ ربوبیت" دے کر بھیجتا رہا ہے، تاکہ اس کی قوم اسے دیکھ کر ایمان لائے۔ جیسا کہ اس سلسلے میں ارشاد باری ہے:

| | |
|---|---|
| لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ | یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو کھلے |
| وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ | کھلے دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان |
| وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ | کے ساتھ کتاب اور میزان اتار دی |
| بِالْقِسْطِ ۔ (حدید: ۲۵) | ہے تاکہ لوگ عدل و قسط پر قائم رہیں۔ |

اگر باری تعالیٰ کی یہ حجت لوگوں پر پوری نہ ہو تو پھر الزام بجائے لوگوں پر عائد ہونے کے اللہ تعالیٰ پر عائد ہوگا کہ اس نے لوگوں کی ہدایت کا سامان نہیں کیا۔ اسی لیے ارشاد ہے کہ وہ اپنے رسولوں کو خوش خبری سنانے اور اللہ کے عذاب سے ڈرانے والے بنا کر بھیجتا رہا ہے:

| | |
|---|---|
| رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ | (وہ اپنے) رسولوں کو بشارت سنانے |

لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۔ (نساء: ۱۶۵)

اور ڈرانے والے بنا کر بھیجنا ہے، تاکہ لوگوں کے لیے اللہ پر الزام عائد ہونے کا کوئی موقع نہ رہے۔

اس لحاظ سے اگر موجودہ دور میں اللہ کی حجت پوری نہ ہو تو پھر حجت کا فلسفہ معکوس ہو جائے گا اور نوعِ انسانی پر الزام عائد نہ ہو سکے گا۔ چونکہ قرآنِ عظیم سارے جہاں کے لیے قیامت تک کے لیے ابدی و سرمدی معجزہ بنا کر بھیجا گیا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ہر دور میں اُس کا معجزہ ظاہر ہو، تاکہ وہ سارے جہاں کے لیے بشارت یا انتباہ کا باعث بن سکے۔ ورنہ وہ ایک ناقص اور نامکمل کلام قرار پائے گا۔

## سورۂ نور کی اہمیت

اسی لیے خدائے علیم و خبیر نے عصرِ جدید پر اتمامِ حجت کے لیے اپنی کتابِ حکمت میں کھلے کھلے دلائل و براہین اتار دیے ہیں جو "ہدایتی" نقطۂ نظر سے نہایت درجہ اہم ہیں۔ یہ دلائل یوں تو کتابِ الٰہی میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں، لیکن اس کی سب سے زیادہ نمایاں اور واضح مثال سورۂ نور ہے جس میں ان دلائلِ ربوبیت کا تذکرہ بڑے اہتمام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس سورت کی ابتدا ہی میں بطورِ تمہید اس میں مذکور دلائل کی موجودگی کی طرف اس طرح توجہ مبذول کرائی گئی ہے:

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَا اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (نور: ۱)

یہ ایسی سورت ہے جسے ہم نے نازل کیا اور اسے فرض قرار دیا ہے اور اس میں واضح دلائل اتار دیے ہیں، تاکہ تم متنبہ ہو سکو۔

اس تمہید میں لفظ "تذکر" لا کر جتا دیا گیا ہے کہ اس سورت میں ایسی واضح نشانیاں یا دلائلِ ربوبیت مذکور ہیں جو غافل انسانوں کو متنبہ کرنے یا انھیں چونکانے والے ہیں۔ چنانچہ اس سورت کے بالکل وسط میں دو جگہ "آیات مبینات" کے الفاظ لا کر ان کے درمیان بعض مظاہرِ ربوبیت کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس کی ابتدا اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اللہ زمین اور آسمان کا نور ہے) کے

جملے سے کی گئی ہے۔

اس موقع پر لفظ آیات اور مبینات کا مطلب سمجھ لینا ضروری ہے۔ آیات، آیۃ کی جمع ہے، جس کے معنی واضح علامت یا نشانی کے ہیں اور مبیّنات بہت زیادہ واضح یا بہت زیادہ وضاحت کرنے والی چیزوں کے لیے آتا ہے اور اس میں لفظ "بینات" سے زیادہ زور پایا جاتا ہے۔ اس سے مراد زیادہ وضاحت کرنے والے یا روشن دلائل ہیں۔ چنانچہ اس مقام پر دلائلِ رُبوبیت بیان کرنے سے پہلے بطورِ تمہید حسب ذیل آیت کریمہ آئی ہے:

| | |
|---|---|
| وَلَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ | (اے لوگو) ہم نے تمہارے پاس |
| مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ | یقیناً بہت روشن دلائل بھیج دیے |
| خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً | ہیں اور تم سے پہلے والوں کی مثال بھی |
| لِّلْمُتَّقِيْنَ | بیان کردی ہے، جو اللہ سے ڈرنے |
| (نور: ۳۴) | والوں کے لیے سبق کی چیز ہے۔ |

پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان اور اہلِ کفر کے اعمال کی تشبیہ بعض محسوس مثالوں کے ذریعہ دینے کے بعد بعض دلائلِ رُبوبیت کا بیان کیا ہے، جن میں وجودِ باری اور اُس کی قدرت وخلاّقیت کی واضح نشانیاں موجود ہیں۔ پھر اس کا اختتام اس طرح کیا ہے:

| | |
|---|---|
| لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ | یقیناً ہم نے کھلے کھلے دلائل اتار |
| مُّبَيِّنٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ | دئے ہیں اور اللہ جسے چاہتا ہے صراط |
| يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ (نور: ۴۶) | مستقیم کی طرف رہنمائی کردیتا ہے۔ |

واضح رہے پورے قرآن میں "آیات مبینات" کے الفاظ صرف تین جگہوں پر لائے گئے ہیں، جن میں یہ دو مقامات بھی شامل ہیں۔ اس سے ان دلائل کی اہمیت واضح ہوتی ہے کہ وہ باریٔ تعالیٰ کی نظر میں کتنے اہم ہیں۔ اس موقع پر چار قسم کے دلائل بیان کیے گئے ہیں جن کا دائرہ زمین سے لے کر آسمان تک تمام اشیاء و مظاہر پر محیط ہے اور وہ ربوبیت کے اسرار و عجائب سے تعلق رکھتے ہیں۔

# عجائبِ رُبوبیت کی ایک جھلک

اس موقع پر ان چار دلائلِ ربوبیت پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے جو ربوبیت (باریٔ تعالیٰ کی کارسازی و کارپردازی) کے اسرار و عجائب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کے ملاحظے سے کفر و الحاد کے شیش محل چکنا چور ہو جاتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ
لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَالطَّيْرُ صَآفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ
عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِمَا يَفْعَلُوْنَ
وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ
اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ
سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ
يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ
يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ وَ
يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ
جِبَالٍ فِيْهَا مِنْ بَرَدٍ
فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَ
يَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ
يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ
بِالْاَبْصَارِ يُقَلِّبُ اللّٰهُ
الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اِنَّ فِيْ
ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي
الْاَبْصَارِ وَاللّٰهُ خَلَقَ

اے مخاطب کیا تجھے علم نہیں ہے کہ زمین و آسمانوں میں جو کوئی بھی ہے سب اللہ کی تسبیح کر رہا ہے؟ اور پرندے بھی پر پھیلائے ہوئے (اس کی تسبیح میں مشغول ہیں) ہر ایک اپنی صلوٰۃ اور تسبیح سے خوب واقف ہے اور وہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اُس کو بخوبی جانتا ہے۔ زمین اور آسمانوں کی ملکیت اللہ ہی کی ہے اور اسی کی طرف (سب کو) لوٹنا ہے۔ کیا تو نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ بادل کو چلاتا ہے، پھر اُسے ملاتا ہے پھر اُسے تہ بتہ (نیچے اوپر) کر دیتا ہے؟ پھر تو دیکھتا ہے کہ بارش اُس (بادل) کے درمیان سے نکل رہی ہے اور آسمان میں جو بادل پہاڑوں (کی طرح ہوتے ہیں) اُن میں سے اولے برساتا ہے، پھر ان اولوں کو (اپنے بندوں میں سے) جس پر چاہتا ہے گراتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اسے باز رکھتا ہے۔ قریب ہے کہ اس کی بجلی کی چمک آنکھوں (کی روشنی) کو فنا کر دے۔ اللہ دن اور

كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ، وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ، يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ، اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

(نور: ۴۱-۴۵)

رات کی الٹ پلٹ کرتا رہتا ہے۔ اس ظہر (ربوبیت) میں آنکھوں والوں کے لیے یقیناً ایک (بہت بڑی) عبرت موجود ہے اور اللہ ہی نے ہر جاندار کو ایک (خاص) پانی سے پیدا کیا ہے، تو ان میں سے کوئی اپنے پیٹ کے بل چلتا ہے، کوئی دو پیروں پر چلتا ہے، کوئی چار پیروں پر چلتا ہے۔ اللہ جو چاہے پیدا کرتا ہے (یعنی بہت سے پیروں پر چلنے والے کو بھی) اللہ یقیناً ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے

چنانچہ ان مظاہر میں اس قدر عجیب و غریب اسباق و بصائر یا دلائل ربوبیت موجود ہیں، جو حد شمار سے بھی باہر ہیں اور ان دلائل و براہین کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و خلاقیت کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ مگر ان سب دلائل پر تفصیلی بحث کے لیے ایک مستقل تصنیف درکار ہے۔ لیکن پھر بھی اس موقع پر بطور اشارہ ان دلائل کی نوعیت پر کچھ روشنی ڈالی جاتی ہے۔

۱۔ پہلی آیت میں یوں تو کئی حقائق مذکور ہیں، مگر مجموعی اعتبار سے اس مرقع پر اس کائنات کی وحدت ثابت کرنا مقصود ہے کہ اس کائنات کے تمام مظاہر اپنے باہمی اختلاف کے باوجود ایک زبردست نظام کے تحت کام کر رہے ہیں، جو نہ صرف وجود باری بلکہ اُس کی وحدانیت کا بھی ثبوت ہے۔ ورنہ یہ کائنات برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ اس کی مزید وضاحت دوسری آیت (زمین اور آسمانوں کی بادشاہت اللہ ہی کے لیے ہے) میں کی گئی ہے۔

۲۔ تیسری آیت میں بادل، بارش اور اولوں کے عجیب و غریب مظاہر کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے یہ حقیقت بیان کی جا رہی ہے کہ "رزق رسانی" کی کنجیاں باری تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ چنانچہ وہ زمین کے جس خطے پر چاہتا ہے بارش برساتا اور اولے گراتا ہے اور جس خطے کو چاہے ان سے محروم رکھتا ہے۔

۳۔ چوتھی آیت (دن رات کے ہیر پھیر) میں دراصل اس کائنات کی تنظیم اور اس کے نظم ونسق کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے کہ اگر باریٔ تعالیٰ کا وجود نہ ہوتا اور یہ کائنات بغیر کسی خالق کے اللٹپ وجود میں آئی ہوتی تو پھر دن رات کی آمد و رفت کا یہ نفیس اور بے داغ نظام کبھی برقرار نہ رہ سکتا تھا۔ چنانچہ سال کے بارہ مہینوں میں دن رات کا جو تفاوت ہوتا ہے وہ ایک اعلیٰ درجے کا نظام ہے اور وہ زمین کی "گردش" کی بدولت ہے۔ چنانچہ ہر سال جاڑا اپنے وقت پر آتا ہے اور گرمی اپنے وقت پر آتی ہے اور اس میں کسی بھی سال کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین انتہائی منظم طریقے سے گردش کر رہی ہے اور اس کی باگ ڈور خالقِ ارض وسما کے ہاتھ میں ہے۔

۴۔ اور آخری آیت میں حیوانی دنیا سے متعلق ایک حیرت انگیز علمی حقیقت یہ بیان کی گئی ہے کہ روئے زمین پر جتنے بھی حیوانات پائے جاتے ہیں وہ سب کے سب ایک "خاص پانی" سے پیدا کیے گئے ہیں۔ کیونکہ اس موقع پر لفظ "مآء" نکرہ لایا گیا ہے، لہٰذا اس میں ایک تخصیص پیدا ہو گئی ہے۔ اس علمی حقیقت کا انکشاف آج جدید سائنس نے "پروٹوپلازم" کے طور پر کیا ہے، جو تمام حیوانات میں بلا استثناء پایا جاتا ہے اور وہ پانی سے مرکب ہے۔ اس لحاظ سے اس ربانی اصول کی تصدیق وتائید جدید سائنس کر رہی ہے اور قرآن حکیم کے کلام الٰہی ہونے کا ایک "سائنسی ثبوت" پیش کر رہی ہے۔

۵۔ یہ آیتِ کریمہ باریٔ تعالیٰ کی زبردست قدرت وخلّاقیت کی بھی ایک دلیل ہے کہ دنیا بھر کے لاکھوں حیوانات کا بنیادی نظام مشترک ہے، جو اُس توحید کا بھی ایک ثبوت ہے۔

۶۔ اس آیتِ کریمہ میں نظریۂ ارتقاء کا بھی ردّوابطال موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انواعِ حیات (جملہ جانداروں کو بشمول نباتات) اپنی زبردست قدرت و خلّاقیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے وجود بخشا ہے۔ اسی لیے اس موقع پر صراحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ "اللہ ہی نے ہر جاندار کو پیدا کیا ہے" چنانچہ علمی وعقلی اعتبار سے ان انواعِ حیات میں صورت شکل، رنگ رُوپ، ڈیل ڈول اور طبائع کے اعتبار سے اس قدر شدید اختلافات موجود ہیں کہ ان سب کی

تشریح وتوجیہ نظریۂ ارتقاء کی رو سے کسی بھی طرح ہو ہی نہیں سکتی۔ بلکہ یہ ایک گمراہ کن نظریہ ہے جو خدا کا انکار کرنے کی غرض سے ایجاد کیا گیا ہے اور خود سائنسی حقائق اس ملحدانہ نظریہ کا انکار کرتے ہیں[۱۵]

## فطرت وشریعت کا ایک حسین گلدستہ

واقعہ یہ ہے کہ سورۂ نور ایک خصوصی اہمیت کی حامل اور بالکل منفرد سورت ہے، جس کا موضوع "آیاتِ الٰہی" قرار دیا جاسکتا ہے اور یہ شرعی وتکوینی دونوں ہی حیثیتوں سے نہایت درجہ اہم ہے اور اس اعتبار سے اسے فطرت وشریعت کا ایک حسین گلدستہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس میں جس طرح ان شرعی مسائل کا تذکرہ ہے جو اسلام کے معاشرتی وعائلی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، اسی طرح اس میں ان دلائلِ ربوبیت کا بیان بھی پوری وضاحت کے ساتھ موجود ہے، جن کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں سب سے بڑی علمی حقیقت جو ملحوظ رہنی چاہیے، وہ یہ ہے کہ اس سورت میں لفظ "آیات" سات جگہوں پر مذکور ہے، جن میں سے تین مقامات وہ ہیں جو اوپر مذکور ہو چکے ہیں۔ اب رہے بقیہ چار مقامات تو وہ شرعی احکام ومسائل کے بارے میں وارد ہوئے ہیں۔ کیونکہ لفظ آیات کا اطلاق شرعی احکام ومسائل پر بھی ہوتا ہے، جس طرح کہ اس کا اطلاق علمی وعقلی دلائل اور معجزات پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ سورت کے شروع میں بعض معاشرتی مسائل اور خصوصاً واقعہ "افک" کا بیان کرنے کے بعد مسلمانوں کی نصیحت کے طور پر ارشاد ہوتا ہے:

وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (نور: ۱۸)

اور اللہ تمہارے لیے (اپنے) احکام وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے۔

پھر اس کے بعد بالکل وسط سورت میں وہ تکوینی احکام ومسائل ہیں، جن کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔ پھر اس کے بعد اگلی آیات میں تین مقامات پر شرعی احکام ومسائل کے ضمن میں وقفہ وقفہ سے اور اسلوب بدل بدل کر یہی بات دہرائی گئی ہے، جو یہ ہیں:

| | |
|---|---|
| كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ لَكُمُ الْاٰيَاتِ، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (نور: ۵۸) | اسی طرح اللہ تمہارے لیے احکام واضح کرتا ہے اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ |
| كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيَاتِهٖ، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (نور: ۵۹) | اللہ اسی طرح تمہارے لیے اپنے احکام کی وضاحت کرتا ہے اور اللہ (سب کچھ) جاننے والا اور دانش مند ہے۔ |
| كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (نور: ۶۱) | اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنے احکام کی وضاحت کرتا ہے، تاکہ تم سمجھ سے کام لے سکو۔ |

اس آیتِ کریمہ سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ اہلِ اسلام کو خالص شرعی احکام و مسائل کی عقلی علتوں اور اُن کی حکمتوں پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ کیونکہ اسلامی احکام میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے جو خلافِ عقل ہو۔ لیکن دیکھئے شرعی و تکوینی احکام و مسائل کے درمیان کتنا فرق ہے، نہ صرف الفاظ کے لحاظ سے، بلکہ اُن کے اسلوب کے لحاظ سے بھی۔ چنانچہ تکوینی احکام و مسائل کے لیے "آیات مبینات" کہا گیا جب کہ شرعی مسائل کے لیے "آیات" یا "آیاتہ" کے الفاظ لائے گئے ہیں اور دیگر مواقع پر مختلف پیرایوں میں عالمِ مظاہر میں غور و خوض کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے سورت کے شروع میں جو "تذکّر" کا لفظ لایا گیا ہے وہ خاص تکوینی آیات پر زیادہ منطبق ہوتا نظر آتا ہے، جو نظامِ فطرت سے متعلق ہیں۔

## کائنات، باریٔ تعالیٰ کی صفتِ تکوین کا مظہر

یہ سورت شرعی و تکوینی (علمِ مظاہر سے متعلق) احکام و مسائل پر مشتمل ایک عجیب و غریب سورت ہے، جو اہلِ اسلام کو متنبہ کرتی ہے۔ اس میں یہ سبق موجود ہے کہ مسلمان شرعی مسائل ہی میں منہمک رہ کر تکوینی احکام و مسائل کو فراموش نہ کر دیں۔ بلکہ ان دونوں میں مہارت حاصل کر کے دینِ الٰہی کے تقاضوں کے مطابق میدانِ خلافت میں پیش قدمی کریں۔ مگر حیرت کا مقام ہے کہ انھوں نے نہ صرف

ان صاف وصریح "ہدایتوں" کو نظر انداز کر دیا بلکہ تکوینی علوم ومعارف کا تعلق "کتابِ ہدایت" سے ماننے تک سے بھی انکار کر دیا۔ گویا کہ یہ علوم ومعارف "نجس وناپاک" ہیں۔ چنانچہ اہلِ اسلام کے موجودہ منفی رویے کو دیکھتے ہوئے یہی نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ باری تعالیٰ نے نہایت درجہ اہتمام کے ساتھ ان علوم ومعارف کا تذکرہ کیا ہے۔ کیونکہ یہ معارف اس کی قدرت وخلاّقیت اور اس کی ربوبیت ورحمانیت پر دلالت کرنے والے ہیں اور امام ابوحنیفہ کی تصریح کے مطابق یہ کائنات باری تعالیٰ کی صفت "تکوین" کی مظہر ہے۔ (دیکھئے شرح فقہ اکبر) اور تکوین کا مطلب ہے "خلق وایجاد" اور اس سے باری تعالیٰ کی ربوبیت کا اظہار مقصود ہے اور اس کے نتیجے میں اس کی دیگر صفات بھی ظاہر ہوتی ہیں اور یہ علم دینی ودنیوی دونوں حیثیتوں سے نہایت درجہ اہم ہے، جس کا انکار کرکے آج مسلمان خلافتِ ارض کے میدان میں کافی سزا بھگت چکے ہیں۔

اہلِ اسلام کا فرض تھا کہ وہ سورۂ نور کی رہنمائی میں اس سورت کو ایک بنیادی خاکہ مان کر کتابِ ہدایت کی دیگر آیات کا مطالعہ کرتے، جس کے نتیجے میں اُن پر خدائی "ہدایتوں" یا خدائی اسباق وبصائر کی بارش ہونے لگتی اور وہ کسی بھی علمی حقیقت و صداقت کا انکار کرنے کی جرات نہ کرتے۔ کیونکہ باری تعالےٰ نے اپنی کتابِ ہدایت کو نہایت درجہ آسان اور غیر پیچیدہ کلام کے روپ میں پیش کیا ہے، جس میں عقلی یا فلسفیانہ قسم کی "مشکل پسندی" نہیں ہے چنانچہ کتابِ الٰہی کی ان خصوصیات کا تذکرہ متعدد اسالیب میں جگہ جگہ کیا گیا ہے۔

## وہ علم جو شریعت کا محافظ ہے

غرض سورۂ نور میں "تذکّر" کا جو لفظ لایا گیا ہے وہ متنبہ ہونے یا کسی علمی حقیقت کے منکشف ہونے کے باعث "چونکنے" کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب قرآنی حقائق اور تکوینی یا سائنسی حقائق کا تقابل کیا جائے تو مظاہرِ فطرت میں موجود حقائق کھل کر سامنے آجاتے ہیں، جو نوعِ انسانی کو چونکانے اور انھیں کتابِ ہدایت کا "کمال" ظاہر کرنے والے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں

بطورِ نمونہ چند آیات ملاحظہ ہوں۔

وَهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیَاحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ، حَتّٰۤی اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ، كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰی لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔

(اعراف: ۵۷)

وہی ہے (تمہارا رب) جو ہواؤں کو اپنی رحمت (بارش) سے پہلے خوشخبری کے طور پر بھیجتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ (ہوائیں) بھاری بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں تو ہم اُسے کسی خشک خطے کی طرف ہانک دیتے ہیں اور اُس بادل کے ذریعہ پانی برساتے ہیں اور پھر اُس پانی کے ذریعہ ہر قسم کے میوے اگاتے ہیں۔ اسی طرح ہم مُردوں کو بھی (پھر سے) نکالتے ہیں۔ (اور یہ مظہرِ ربوبیت اس بنا پر ہے) تاکہ تم چونک سکو۔

اس لحاظ سے نباتات حیاتِ ثانی کا بھی سائنٹفک ثبوت پیش کر رہے ہیں۔[۵۲]

وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ فَفِرُّوْۤا اِلَی اللّٰهِ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ۔

(ذاریات: ۴۹۔۵۰)

اور ہم نے ہر چیز کا جوڑا پیدا کیا ہے، تاکہ تم متنبہ ہو سکو۔ لہٰذا تم (اس مظہرِ ربوبیت کے مشاہدے کے باعث) اللہ کی طرف دوڑو، میں تو صرف اُس کی طرف سے تم کو کھلے طور پر ڈرانے والا ہوں۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰی فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ

(واقعہ: ۶۲)

تم (اپنی) تخلیقِ اول (کا حال) اچھی طرح جان چکے ہو، تو تم کو تنبہ کیوں نہیں حاصل ہوتا (کہ تخلیقِ ثانی بھی اسی طرح) واقع ہو سکتی ہے؟[۵۳]

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا

(فرقان: ۶۲)

وہی ہے (تمہارا رب) جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا بنایا، اس شخص کے لیے جو خبردار ہونا اور شکرگزار بننا چاہے۔

| | |
|---|---|
| وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ (نحل: ۱۳) | اور جو کچھ اُس نے زمین میں تمہارے لیے پھیلا رکھا ہے اس کی رنگتیں مختلف ہیں۔ اس مظہر (ربوبیت) میں نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے ایک خاص نشانی موجود ہے۔ |

اس لحاظ سے مظاہرِ فطرت میں انواع و اقسام کے دلائلِ ربوبیت موجود ہیں، جو ان میں غور و خوض کے نتیجہ میں خدائی اسباق و بصائر کی شکل میں ظہور پذیر ہو کر نوعِ انسانی کو متنبہ کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔ کیونکہ باری تعالیٰ نے یہ کائنات کھیل کود میں پیدا نہیں کی، بلکہ اُسے نہایت درجہ قوانین کے تحت اور پوری منصوبہ بندی کے ساتھ وجود عطا کیا ہے۔ اسی لیے باری تعالیٰ نے نظامِ کائنات میں غور و خوض اور تحقیق و تفتیش کی دعوت دی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دلائلِ رُبوبیت انسانی کوششوں سے اور انسانی علوم و فنون ہی کے ذریعہ سامنے آ سکتے ہیں، جب کہ ان علوم کے حقائق و معارف کا تقابل کتابِ الٰہی میں موجود حقائق و معارف سے کیا جائے[عہ] اسی لیے نظامِ کائنات کے ساتھ ساتھ کتابِ الٰہی میں بھی تفکّر و تدبّر کرنے پر ابھارا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيَاتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (ص: ۲۹) | یہ ایک بابرکت کتاب ہے جو ہم نے آپ کے پاس بھیجی ہے، تاکہ وہ لوگ اس کی آیات میں تدبر کریں اور پختہ عقل والے (اس کے انوکھے مضامین پر) چونک سکیں۔ |

حاصل یہ کہ کتابِ الٰہی کو مختلف قسم کے "تذکروں" سے پوری طرح لیس کر دیا گیا ہے، جو نظامِ کائنات سے متعلق ہیں۔ اسی بنا پر اسے بعض مقامات پر "کتاب تذکرہ" بھی کہا گیا ہے اور اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ان کے ذریعہ گمراہ لوگوں کو آگاہ اور متنبہ کیا جائے تاکہ وہ قرآنِ عظیم کو کوئی فرسودہ یا پرانے دور کی یادگار چیز تصور کرتے ہوئے اسے نظر انداز نہ کریں۔ کیونکہ وہ ہر دور کے علوم و فنون اور عصری مسائل و مباحث کے ساتھ چلنے والی ایک بے نظیر کتاب ہے۔ کیونکہ اس کا نازل

کرنے والا ہر دور کے علوم و مسائل سے بخوبی واقف ہے۔ اسی لیے اس نے اسے ہر دور کے تقاضوں کے مطابق مختلف قسم کے "علمی ہتھیاروں" لیس کر دیا ہے تاکہ دینِ الٰہی ہمیشہ تر و تازہ رہے اور وہ کبھی مغلوب نہ ہو۔ کیونکہ دینِ الٰہی اگر مغلوب یا دلیل و استدلال کے میدان میں فیل ہو جائے تو پھر اس کے نتیجے میں کفر و شرک، الحاد و لادینیت اور باطل فلسفوں اور طاغوتی طاقتوں کو غلبہ حاصل ہو جائے گا اور وہ دینِ الٰہی کا قافیہ تنگ کر دیں گے۔ اسی لیے ارشاد باری ہے

| | |
|---|---|
| وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ | اور اگر (دین) حق ان کی خواہشات |
| لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ | کی پیروی کرنے لگ جاتا تو زمین اور |
| وَمَنْ فِيْهِنَّ | آسمانوں اور ان میں جو کوئی ہے، سب |
| (مومنون: ۷۱) | (کا نظام) درہم برہم ہو جاتا۔ |

غرض باری تعالیٰ عصری ذہنیت کے توڑ کے لیے ہر دور میں اپنی ربوبیت کے کرشمے دکھاتا رہتا ہے۔ اسی لیے ہر دور میں دینِ الٰہی کی تجدید ضروری ہے، تاکہ وہ دلیل و حجت کے میدان میں باطل فلسفوں اور باطل نظریات پر ہمیشہ غالب رہے، اسی لیے فرمایا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ | وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو |
| اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ | اپنے منہ سے بجھا دیں، مگر اللہ اپنی روشنی |
| اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ | مکمل کیے بغیر نہیں رہے گا، اگرچہ منکرین |
| الْكٰفِرُوْنَ (توبہ: ۳۲) | کو یہ بات ناپسند ہی کیوں نہ ہو۔ |

اس لحاظ سے علمِ تکوین یعنی علمِ مظاہر یا علم الاشیاء کوئی معمولی علم نہیں ہے، بلکہ یہ وہی علم الاسماء ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کو پہلے ہی دن عطا کر دیا گیا تھا۔ (بقرہ: ۳۱) اور پھر ایک انوکھے طریقہ سے فرشتوں کے ساتھ مباحثہ کر کے اس کی اہمیت بھی ثابت کر دی تھی۔ تاکہ اہلِ اسلام میدانِ خلافت میں اسے کسی بھی طرح نظر انداز نہ کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہی وہ علم ہے جو اسلامی شریعت کا "باڈی گارڈ" بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ اسلامی شریعت کا دفاعی شعبہ ہے، جو دینی و دنیوی دونوں حیثیتوں سے مسلمانوں کا سر بلند کر سکتا ہے۔ یعنی مسلمان اس علم میں فائق ہو کر نہ صرف اسلام

اور اسلامی شریعت کو دلیل و استدلال کے میدان میں غالب کر سکتے ہیں، بلکہ وہ گمراہ قوموں کی اصلاح بھی کر سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ علم ملتِ اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ اور خلافتِ ارض کی بازیافت میں نہایت درجہ اہم رول ادا کر سکتا ہے۔ اسی لیے فرمانِ الٰہی ہے :

| | |
|---|---|
| هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ | وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت |
| بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ | اور دینِ حق دے کر بھیجا ہے، تاکہ وہ اُسے |
| عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ | تمام ادیان پر غالب کر دے، اگرچہ مشرکین |
| الْمُشْرِكُوْنَ (توبہ: ۳۳) | اسے ناپسند ہی کیوں نہ کریں۔ |

اسی بنا پر اس علم کو باری تعالیٰ نے اپنی کتابِ ابدی میں بڑے اہتمام کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کو خوب وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے، جس میں کہیں بھی کوئی اشکال یا شک و شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اگر مسلمان اس سے بے تعلق ہیں تو اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جو قوم فطرت و شریعت میں تفریق کرے گی وہ خوفناک اور سنگین قسم کے نتائج سے دوچار ہوگی اور اس کے نتیجے میں معاشرے میں فکری اعتبار سے انتشار پیدا ہوگا۔ کیونکہ فطرت و شریعت یا علم و عقیدے میں تطبیق ہمیشہ ضروری ہوتی ہے، ورنہ اس کے نتیجے میں روحانیت مغلوب اور مادیت غالب آجائے گی، جیسا کہ آج اہلِ اسلام اور اہلِ مغرب کا حال ہے اور مادیت کے اس غلبے کی بنا پر خود مسلم معاشرہ بھی اسلام جیسے دینِ ابدی کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے لگا ہے۔

## سائنس اور مادیت میں فرق

اس سلسلے میں دیندار طبقے کی ایک اور غلط فہمی یہ ہے کہ وہ تکوینی یا سائنسی علوم کو "مادیت" کے مترادف تصور کرتے ہوئے ان سے چھوت چھات برت رہے ہیں۔ حالانکہ سائنس کے جو "خالص" نظریات و تحقیقات ہیں اُن میں مادیت کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ یعنی وہ تجرباتی و مشاہداتی حقائق جو "قوانینِ ربوبیت" کا درجہ حاصل کر چکے ہوں ان میں مادیت کی کوئی چھاپ نہیں ہے، بلکہ ان قوانین کی تشریح و توجیہہ مادہ پرست

خدا کا نام لیے بغیر جس انداز میں کرتے ہیں وہ ضرور قابلِ اعتراض ہے۔ اس اعتبار سے سائنسی حقائق و اکتشافات اور مادہ پرستی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ لہٰذا ان دونوں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ سائنس جن چیزوں کا مطالعہ کرتی ہے وہ مظاہرِ ربوبیت ہیں، یعنی باری تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزیں۔ اس لحاظ سے سائنسی علوم کے ذریعہ اس کائنات کا جو منظم مطالعہ کیا جا رہا ہے وہ اسلامی نقطۂ نظر سے دراصل "مطالعۂ ربوبیت" ہے، خواہ اس بارے میں مادہ پرستوں کے جو بھی نظریات اور جو بھی مقاصد ہوں۔ اسی بنا پر آج خود مادہ پرستوں کے ہاتھوں انجانے پن میں وہ تمام حقائق ظہور پذیر ہو رہے ہیں، جن کو باری تعالیٰ اپنے ازلی منصوبے کے طور پر ثابت کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا ان علوم سے ہمیں کسی بھی قسم کے اندیشے میں مبتلا ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے اور پھر ہمارے پاس قرآنِ عظیم جیسا ابدی و سرمدی صحیفہ موجود ہے جو اس سلسلے میں ہماری پوری پوری مدد اور رہنمائی کرنے کے لیے تیار ہے۔ اسی وجہ سے اسے مختلف قسم کے دلائل و براہین سے مزین کر کے نہ صرف قرآن کو "فرقان" کہا گیا ہے بلکہ خود اپنے دلائل ربوبیت کو بھی فرقان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے یعنی یہ ایسے دلائل ہیں جو حق و باطل میں فرق و امتیاز کرنے والے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰى | (یہ قرآن) ہدایت اور حق و باطل |
| وَالْفُرْقَانَ (بقرہ: ۱۸۵) | میں فرق کرنے والے دلائل پر مشتمل ہے۔ |
| تَبَارَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ | بڑا ہی بابرکت ہے وہ جس نے اپنے |
| عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعَالَمِيْنَ | بندے پر فرقان (کسوٹی) نازل کی تاکہ |
| نَذِيْرًا۔ (فرقان: ۱) | وہ سارے جہاں کو خبردار کر سکے۔ |

قرآنِ عظیم ایسے ابدی اور لازوال حقائق پر مشتمل ہے کہ اگر اسے پہاڑ پر بھی نازل کر دیا جاتا تو وہ اس کی ہیبت سے پھٹ کر پاش پاش ہو جاتا۔

| | |
|---|---|
| لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ | اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے |
| عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا | تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے |
| مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (حشر: ۲۱) | جھک جاتا اور پھٹ پڑتا۔ |

# قرآن آخری دلیل وحجت

خلاصۂ کلام یہ کہ آج تکوینی یا سائنسی وتجرباتی علوم کی بے انتہا اہمیت ہوگئی ہے، نہ صرف دلیل واستدلال کے نقطۂ نظر سے بلکہ خود مادی وسیاسی اعتبار سے بھی۔ ان علوم میں برتری حاصل کرنے کے بعد ہی مسلمان ان دونوں حیثیتوں سے اپنی سربلندی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرسکتے ہیں اور یہ باری تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ وہ اس میدان کو سر کئے بغیر نہ دینِ الٰہی کو غالب کرسکتے ہیں اور نہ عالمِ انسانی پر حجت پوری کرسکتے ہیں۔ یہ علوم ایک دو دھاری تلوار کی طرح ہیں جو علمی ومادی دونوں پہلوؤں کے حامل ہیں۔ لہٰذا جو قوم آج ان علوم سے کنارہ کشی اختیار کرلے گی وہ دنیا کے اسٹیج سے ہٹادی جائے گی۔ یہ دیوار کا لکھا ہے، جسے اگر مسلمانوں نے نظرانداز کردیا تو پھر خدانخواستہ ان کا نام ونشان تک باقی نہیں رہے گا۔

غرض قرآنِ عظیم ایک واضح اور غیر پیچیدہ کلام ہے، جس میں ہر مسئلے اور قضیے کا حل موجود ہے۔ وہ ہر قسم کے اختلافی مسائل میں فیصلہ کرنے اور صحیح راہِ ہدایت واضح کرنے والی ایک عجیب وغریب کتاب ہے۔ لیکن اگر اس کے باوجود خود حاملینِ قرآن ہی اس سے ہدایت حاصل کرنا اور اختلافی مسائل میں اس سے رجوع کرنا ترک کردیں تو پھر اس میں قصور کس کا ہے؟ کیا کوئی دوسری کتاب نازل ہونے والی ہے جس کے انتظار میں وہ چشم براہ ہیں؟

| | |
|---|---|
| فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰیٰتِهٖ یُؤْمِنُوْنَ (جاثیہ: ۶) | تو وہ اللہ اور اُس کی آیات کے بعد آخر کس چیز پر ایمان لائیں گے؟ |
| اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (محمد: ۶) | تو کیا یہ لوگ قرآن میں تدبّر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں؟ |
| وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (فرقان: ۳۰) | اور رسول کہے گا کہ اے رب میری قوم نے اس قرآن کو (پوری طرح) نظرانداز کردیا تھا۔ |

| | |
|---|---|
| وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (قمر: ) | اور ہم نے اس قرآن کو سبق آموزی کے لیے آسان کر دیا ہے، تو ہے کوئی سبق حاصل کرنے والا؟ |
| وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا (بنی اسرائیل: ۸۲) | اور ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں جو اہل ایمان کے لیے شفا اور رحمت کا باعث ہیں، مگر اس سے ظالموں کے نقصان ہی میں اضافہ ہوتا ہے۔ |
| اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا (بنی اسرائیل: ۹) | یہ قرآن اُس راستے کی طرف لے جاتا ہے جو بالکل سیدھا ہے اور وہ اُن اہلِ ایمان کو خوشخبری سناتا ہے جو درست کام کرتے ہیں کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ |
| وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (نحل: ۸۹) | اور ہم نے آپ پر وہ کتاب اتار دی ہے جو ہر چیز (یا ہر مسئلے) کی خوب وضاحت کرتی ہے اور (اسی بنا پر) وہ اہلِ اسلام کے لیے ہدایت اور خوشخبری ہے۔ |
| يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا (احزاب: ۷۰) | اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور (لوگوں سے) درست بات کہو۔ |

## ۔حواشی۔

۱؎ واضح رہے کہ قرآن میں اکثر مواقع پر اس تصدیق سے مراد سابقہ صحفِ سماوی ہیں، مگر اُسی کے لیے ایک دوسرا اسلوب "مصدقاً لما بین یدیہ" کا لایا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہاں پر اس سے مراد نظامِ کائنات کے حقائق بھی ہو سکتے ہیں۔ اس موضوع پر ہم نے اپنے ایک مضمون "قرآن اور کائنات میں مطابقت" میں تفصیلی بحث کی ہے۔

۲؎ چنانچہ اس موضوع پر راقم سطور کی ایک تحقیقی کتاب "تخلیقِ آدم اور نظریۂ ارتقاء" کے نام سے منظرِ عام پر آگئی ہے اور ایک دوسری کتاب "قرآنِ عظیم اور نظریۂ ارتقاء" کے نام سے زیرِ تصنیف ہے۔

۳؎ اس موضوع پر تفصیل کے لیے ہماری کتاب "قرآن حکیم اور علم نباتات" دیکھنی چاہیے۔

۴؎ اس آیتِ کریمہ پر تفصیلی بحث ہم نے اپنی بعض کتابوں میں کی ہے۔

## سیر و سوانح

# علامہ ابوحیان اندلسی
## حیات و خدمات

ڈاکٹر محمد بلال حسین
مترجم: مولانا محمد جرجیس کریمی

علامہ امام ابوحیان کا شمار اندلس کے ان اکابر علماء میں ہوتا ہے جنھوں نے عظیم اور عالم گیر شہرت پائی۔ ان کی گراں قدر تصنیفات کو جتنی مقبولیت حاصل ہوئی اتنی اس زمانے کی دیگر تصانیف کو حاصل نہیں ہوسکی یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت جہار دانگ عالم میں مشہور ہوگئی اور علماء و مورخین نے اپنی کتابوں میں ان کی سوانحی تفصیل سے بیان کی، ان کی بیش قیمت تصنیفات کا تذکرہ بڑے اہتمام سے کیا اور ان کو تفسیر، ادب، نحو اور قرأت کا امام قرار دیا۔

### نام و نسب

سوانح نگاروں اور مورخین نے آپ کا نام محمد، کنیت ابوحیان اور لقب اثیرالدین بیان کیا ہے۔ پورا سلسلۂ نسب اس طرح ہے: ابوعبداللہ اثیرالدین ابوحیان محمد بن یوسف بن علی بن یوسف بن حیان اندلسی غرناطی، جیانی، نفزی[1]

### جائے پیدائش اور وطن

آپ کی ولادت غرناطہ میں ۶۵۴ھ کو شوال کی آخری تاریخوں میں ایک پڑھے لکھے اور شریف خاندان میں ہوئی۔ بعض مورخین نے بیان کیا ہے ابوحیان کی پیدائش مطخشارش میں ہوئی جو غرناطہ کا شہری علاقہ ہے اور غرناطہ اسلامی اندلس کا اولین مرکز خلافت رہا ہے۔

جو اندلس کا سب سے زیادہ حسین، خوبصورت اور محفوظ ترین علاقہ ہے۔ یہ باغات اور نہروں سے معمور ہے۔ علامہ مقری نے مشہور مورخ صفدی کی اس بات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ ابوحیان کی پیدائش مطخشارش میں ہوئی اس پر تو تمام مورخین کا اتفاق ہے لیکن مطخشارش شہر ہے یہ بات صحیح نہیں صحیح یہ ہے کہ وہ غرناطہ کا ایک مضافاتی گاؤں ہے[۲] اس لیے رعینی نے لکھا ہے کہ ابوحیان کی پیدائش غرناطہ کے مطخشارش مقام پر ہوئی۔ یہی خیال ابن جماعہ کا بھی ہے[۳]

## تعلیم و تربیت

ابوحیان نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر مکمل کی۔ پھر اندلس کے شیوخ اور اہل علم سے کسب فیض کیا انھوں نے خطیب عبدالحق بن علی، ابوجعفر بن الطباع اور حافظ ابوعلی بن الاحوص سے قرآن اور تجوید کی تعلیم حاصل کی اور اندلس کے بہت سے مشائخ سے سماعت کی۔ اس کا ذکر انھوں نے خود اس طرح کیا ہے "میں علماء سے شرف تلمذ حاصل کرتا۔ فقہاء سے استفادہ کرتا اور ان کی مجلسوں میں بیٹھا کرتا اور ان کے طریقوں پر چلا کرتا تھا" اس طرح وہ متعدد علماء عصر سے اکتساب فیض کرتے رہے اور حصول علم کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کرتے رہے یہاں تک کہ مصر میں مستقل پڑاؤ ڈال دیا[۴]۔

اندلس کے علماء سے بنیادی علوم حاصل کرنے کے بعد آپ نے وہاں سے رخت سفر باندھا اور بلاد مغرب (مراکش) اور پھر وہاں سے مصر تشریف لے گئے اور وہاں کے علماء و فضلاء سے کسب فیض کیا۔ وہاں جن علماء سے شرف تلمذ حاصل کیا ان میں ابوطاہر اسماعیل بن عبداللہ المنجی، شیخ بہاء الدین بن النحاس، وجیہ الدین بن الدہان قطب القسطلانی اور ابن الاناطی خاص طور سے قابل ذکر ہیں اس کے علاوہ مصر کے متعدد شہروں جیسے اسکندریہ اور قاہرہ کا اور اس کے علاوہ افریقہ کا سفر کیا اور وہاں کے علماء و فضلا سے قرآن، حدیث اور ادب سے متعلق علوم حاصل کیے[۵]۔

فنی طور پر قرآن کی متعدد قرأتیں (پڑھنے کا طریقہ) بیان کی گئی ہیں۔ علامہ ابوحیان ان تمام طریقوں سے واقف تھے۔ اندلس میں وہ قرآن کو سات قراتوں کے ساتھ پڑھ چکے تھے پھر جب وہ مصر اور افریقہ پہونچے تو وہاں انھوں نے آٹھ قراتوں کے

قرآن پڑھا[۵]۔ اس کے علاوہ انھوں نے ابوجعفر بن الزبیر اور ابوالحسن حازم بن محمد اندلسی جیسے اکابر علماء سے علم بدیع اور علم بیان کی تحصیل کی[۶]۔ دوسری طرف انھوں نے ابوجعفر ابراہیم ثقفی، شیخ ابوالحسن الابذی، ابن ابی الاحوص، ابن الصائغ اور ابوجعفر اللبلی جیسے علماء سے لغت، نحو، ادب اور مشہور شعرائے عرب کے دواوین پڑھے نیز انھوں نے اندلس، حجاز، مصر اور افریقہ میں تقریباً ساڑھے چار سو شیوخ سے حدیث کی سماعت فرمائی[۷]۔

مورخین نے بیان کیا ہے کہ علامہ ابو حیان کے غرناطہ کو خیرباد کہنے اور دوسرے ممالک کا رخ کرنے کا سبب ان کی مخصوص مزاجی کیفیت تھی جس کی وجہ سے انھوں نے اپنے استاد ابوجعفر بن الطباع کی مخالفت شروع کر دی۔ جب دونوں کے درمیان ان بن ہوگئی تو انھوں نے استاذ کے خلاف تحقیر آمیز رویہ اختیار کیا اور ان کے رد میں کتابیں لکھیں اور ان کی روایتوں کی تکذیب کی۔ جب یہ معاملہ سلطان وقت تک پہنچا تو اس نے حکم دیا کہ انھیں دربار میں طلب کیا جائے اور سزا دی جائے۔ اس کے بعد وہ خفیہ طور پر سمندر پار کر کے اندلس سے نکل گئے اور مشرق پہونچ گئے اور مسلسل کوچ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ مصر میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

جلال الدین السیوطی نے ان کے اندلس سے کوچ کرنے کا ایک دوسرا واقعہ بیان کیا ہے جو پہلے واقعہ سے مطابقت نہیں رکھتا وہ یہ کہ غرناطہ کے ایک منطق و فلسفہ کے ماہر عالم نے سلطان غرناطہ سے درخواست کی کہ میں بڑھاپے کی عمر کو پہونچ چکا ہوں اور موت کا وقت قریب آگیا ہے۔ لہٰذا مجھے کچھ ایسے طلباء فراہم کر دیجئے جنھیں میں یہ علوم سکھا سکوں تاکہ وہ میرے بعد سلطان کو فائدہ پہونچاتے رہیں۔ ابوحیان فرماتے ہیں کہ اس موقع پر سلطان کو میری نشان دہی کی گئی اور مجھے اچھی تنخواہ اور بہتر سہولیات کی پیش کش کی گئی لیکن میں نے اس سے انکار کر دیا اور اس خدشہ کے تحت کہ میں اس پر مجبور نہ کر دیا جاؤں اندلس کو خیرباد کہہ دیا[۸]۔

## اساتذہ

علامہ ابوحیان نے جن اکابر علماء، فقہاء، ادباء اور محدثین سے کسب فیض کیا

ان کی تعداد کم وبیش ساڑھے چار سو تک ہے بلکہ بعض تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق ڈیڑھ ہزار سے اوپر پہونچتی ہے۔ کتاب البیان فی شیوخ ابی حیان میں ان کے نام بھی بیان کر دئے گئے ہیں[۱۰] ذیل میں چند اساتذہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ ابو عبداللہ رضی الدین محمد بن علی بن یوسف الانصاری الشاطبی بلنشیہ میں پیدا ہوئے۔ قاہرہ میں ۶۸۴ھ میں وفات پائی[۱۱] آپ علم قرأت کے ماہر لغت نحو اور علم بیان کے امام تھے ان سے ابوحیان اندلسی جمال الدین المزّی اور قطب الحلبی وغیرہ نے روایت کی ہے۔ علامہ ابوحیان نے ان کی وفات پر مرثیہ کہا ہے[۱۲]

۲۔ محمد بن علی بن وہب المعروف بابن دقیق العید۔ آپ حافظ، محدث، فقیہ، اصولی، ادیب، شاعر، نحوی، خطیب، امام اور مختلف علوم وفنون کے ماہر، فہم و فراست کے پیکر، خاموش طبع، عامل بالسنۃ اور کثیر المطالعہ تھے[۱۳] آپ حجاز میں بحر احمر کے ایک ساحلی مقام ینبع میں پیدا ہوئے، قوص میں نشو ونما پائی اور مصر میں امور قضا کے ذمہ دار بنائے گئے۔ علامہ ابن دقیق العید نے جملہ اسلامی علوم وفنون میں مہارت حاصل کی اور اپنے ہم عصروں پر فائق رہے۔ آپ سے وقت کے اکابر علماء نے استفادہ کیا۔ آپ کو آفاقی شہرت حاصل ہوئی دور دراز علاقوں سے لوگ آپ کے پاس استفادہ کے لیے تشریف لاتے ان ہی میں ابوحیان اندلسی بھی ہیں جن کو علامہ ابن دقیق العید نے علمی استناد سے سرفراز کیا۔ آپ کی وفات ۷۰۳ھ میں ہوئی[۱۴]

۳۔ ابو جعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الثقفی، العاصمی، الجیانی، الغرناطی۔ آپ مفسر، محدث، مورخ، نحوی، اصولی، ادیب اور بہترین تنقید نگار تھے۔ آپ کی پیدائش جیان میں ۶۲۷ھ میں ہوئی اور وہیں نشو ونما پائی۔ ان سے ابوحیان نے علوم حدیث کی تحصیل کی۔ آپ علامہ موصوف کے اکابر اساتذہ میں سے تھے آپ کی وفات ۸ ربیع الاول بروز منگل ۷۰۸ھ میں ہوئی[۱۵]

۴۔ شیخ ابوالحسن حازم بن محمد بن حسن الانصاری القرطبی۔ آپ لغت، نحو، بیان، عروض اور نظم ونثر کے اپنے زمانے کے منفرد عالم تھے۔ اس کے علاوہ عرب کے احوال واخبار ان کے لغات اور اشعار کے حافظ تھے۔ آپ کا ایک دیوان

بھی ہے[۱۶] ابوحیان نے ان سے نحو، بدیع اور بیان کے علوم حاصل کیے۔ شیخ ابوالحسن حازم نے ۶۸۴ھ میں وفات پائی[۱۷]

## تلامذہ

علامہ ابوحیان کے شیوخ کی طرح ان کے تلامذہ کی بھی تعداد بہت ہے۔ انھوں نے ان سے کسب فیض ہی نہیں کیا بلکہ ان کے علم کو عام کیا اور ان کا نام بلند کیا۔ ان تلامذہ کے ذریعے ابوحیان کو غیر معمولی شہرت ملی۔ یہاں صرف دو تلامذہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ ابوالحسن تقی الدین علی بن عبدالکافی السبکی۔ آپ مفسر، محدث، فقیہ، نحوی، اصولی، لغوی، مورخ، علم قرأت کے ماہر اور مختلف علوم و فنون کے شہسوار تھے[۱۸] آپ کی پیدائش ۶۸۳ھ میں مصر کے ضلع منوفیہ کے مقام سبک العید میں ہوئی۔ آپ نے کم سنی میں اپنے والد سے پھر متعدد علماء و فقہاء سے علم فقہ کی تحصیل کی۔ پھر علامہ علم الدین العراقی سے تفسیر، تقی الصائب سے علم قرأت، علامہ باجی سے علم اصول، علامہ ابوحیان سے علم نحو اور علامہ شرف الدمیاطی سے علم حدیث حاصل کیے۔ علامہ جلال القزوینی کے بعد آپ ملک شام میں قضا کے عہدہ پر فائز کیے گئے، پھر دارالحدیث اشرفیہ دمشق میں شیخ الحدیث مقرر ہوئے۔ ایک طویل عرصہ تک آپ نے دمشق جامع مسجد میں خطابت کے فرائض انجام دیئے[۱۹]۔ آپ کی وفات ۷۵۶ھ میں مصر میں ہوئی۔ صوفیہ کے قبرستان میں مدفون ہیں۔

۲۔ ابومحمد جمال الدین عبدالرحیم بن الحسن بن علی الاسنوی۔ آپ مفسر، اصولی، فقیہ، مورخ، نحوی، لغوی، ادیب، شاعر۔ عروض، قافیہ اور فن کتابت کے ماہر تھے۔ مصر کے بالائی علاقہ اسنا میں ۷۰۴ھ میں پیدا ہوئے[۲۰] اور وہیں پرورش پائی اور اسلامی اور عربی علوم حاصل کیے۔ قرآن مجید اور علامہ ابواسحاق شیرازی کی کتاب "التنبیہ" حفظ کرلی۔ پھر اپنے وقت کے مشہور مراکز علم و فن کی طرف سفر کیا اور بڑے بڑے علماء و فضلاء سے استفادہ کیا۔ آپ نے علامہ ابوحیان اندلسی سے عربی قواعد کا درس لیا اور امام ابن مالک کی کتاب "التسہیل" پڑھی۔

اس وقت آپ کی عمر صرف بیس سال تھی۔ علامہ ابوحیان نے آپ کو اسی عمر میں علمی استناد سے نوازا آپ کی وفات قاہرہ میں ۷۲۲ھ کو ہوئی[۲۱]

## عقیدہ و مسلک

علامہ ابوحیان راسخ العقیدہ، بدعات سے مبرا، فلسفیانہ موشگافیوں، اعتزال اور تجسیم جیسے باطل عقائد سے دور ظاہری المسلک تھے۔ جب آپ قاہرہ آئے تو وہاں اس مسلک کی اتباع کرنے والے کم نظر آئے لہٰذا آپ نے شافعی مسلک اختیار کر لیا اور فقہ شافعی کی کتابوں کا مطالعہ کیا[۲۲] بعض مورخین نے لکھا ہے کہ شروع میں آپ مالکی مسلک کے پیرو تھے جو کہ اندلس اور مراکش میں عام لوگوں کا مسلک ہے۔ پھر ظاہری مسلک کو اندلس میں رواج ملا تو اسے اختیار کر لیا۔ آخر میں شافعی المسلک ہو گئے تھے[۲۳] ابوالبقاء نے بیان کیا ہے کہ علامہ ابوحیان ہمیشہ ظاہری مسلک کے پابند رہے۔ ابن حجر العسقلانی نے اس بارے میں خود علامہ موصوف کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "یہ محال ہے کہ جس شخص کے ذہن میں ظاہری مسلک رچ بس گیا ہو وہ اس سے پھر جائے"[۲۴] فی الجملہ ظاہری مسلک تمام اکابر علماء سلف کا مسلک رہا ہے۔ یہ مسلک کتاب و سنت کے ظاہر پر مبنی ہے اور اس میں دور دراز تاویلات اور قیاسی آراء کا دخل نہیں ہوتا۔ اس لیے علامہ ابوحیان کا ظاہری مسلک پر عمل پیرا ہونا ان کے لیے کوئی عیب نہیں ہے[۲۵]

## وفات

علامہ ابوحیان اندلسی نے آخر عمر میں مصر میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں آپ کی وفات ۷۴۵ھ میں ہوئی۔ آپ صوفیاء کے قبرستان میں مدفون ہیں[۲۶] علامہ صفدی نے آپ کی وفات کے بعد ایک مرثیہ لکھا تھا[۲۷]

## علمی خدمات

ابوحیان ایک مفسر، محدث، مورخ، ماہر قرأت، ادیب، شاعر، لغوی اور نحوی

تھے بلکہ جملہ علوم وفنون میں اپنی مثال آپ تھے، جس طرح علم وادب میں آپ کا کوئی نظیر نہیں تھا اسی طرح تفسیر وحدیث میں بھی آپ فقید المثال تھے۔ علم اسماء الرجال پر آپ کی خصوصی نظر تھی اور علم قرأت کے بھی آپ ماہر تھے۔ صرف ونحو میں بھی آپ کی معلومات وسیع تر تھیں شعروشاعری کے میدان کے بھی آپ شہسوار تھے[۲۸] اور آپ نے ان تمام علوم وفنون سے متعلق گراں قدر تصنیفات چھوڑی ہیں چند مشہور تصانیف درج ذیل ہیں:۔

| | |
|---|---|
| ۱۔ البحر المحیط فی تفسیر القرآن الکریم | ۲۔ غریب القرآن |
| ۳۔ کتاب التذکرہ | ۴۔ النکت الحسان فی شرح غایۃ الاحسان |
| ۵۔ الاعلام بارکان الاسلام | ۶۔ نہایۃ الاغراب فی علمی التصریف والاعراب |
| ۷۔ اللمحۃ البدریۃ فی علم العربیۃ | ۸۔ الاسفار الملخص من کتاب الصفات |
| ۹۔ تحفۃ الندرس فی نحاۃ الاندلس | ۱۰۔ الروض الباسم فی قرأۃ عاصم |
| ۱۱۔ التدریب فی تمثیل التقریب | ۱۲۔ خلاصۃ البیان |
| ۱۳۔ منطق الخرس بلسان الفرس | ۱۴۔ نور القبس فی لسان الحبش |
| ۱۵۔ منہاج السالک | ۱۶۔ الاثیر فی قرأۃ ابن کثیر |
| ۱۷۔ الوہاج مختصر المنہاج | ۱۸۔ شرح التسہیل |

۱۹۔ ارتشاف الضرب فی لسان العرب[۲۹]

انھیں میں سے بعض تصانیف کا خصوصی ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ البحر المحیط فی التفسیر[۳۰] یہ علامہ موصوف کی اہم ترین تصنیفات میں سے ہے جس کے ذریعہ انھیں عالم گیر شہرت حاصل ہوئی۔ یہ ان کا گراں قدر علمی سرمایہ ہے جو ہم تک پہنچا ہے۔ علماء نے اس کو ان کی سب سے قیمتی تصنیف قرار دیا ہے جس میں قرآنی آیات سے متعلق عجیب وغریب مباحث ہیں۔ یہ بنیادی کتاب ہے جو الفاظ قرآن کے اعراب کی مختلف توجیہات سے بحث کرتی ہے۔ اس میں نحوی مسائل سے بحث بہت نمایاں اور بڑے پیمانے پر ہے اسی لیے یہ قرآن کی تفسیر سے زیادہ نحو کی کتاب معلوم ہوتی ہے[۳۱] یہ آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ جو مطبعۃ السعادۃ مصر سے ۱۳۲۸ھ میں اور مطبعۃ دار الفکر بیروت سے ۱۴۱۲ھ / ۱۹۹۲ء میں صدقی

محمد جمیل کی تحقیق کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

۲۔ اللمحۃ البدریۃ فی علم العربیۃ[۳۳] یہ نحو کی ایک مختصر کتاب ہے جس میں سات ابواب ہیں۔ ابن ہشام النحوی (متوفی ۷۶۳ھ) نے اس کی شرح لکھی ہے اور زین الدین عمر بن مظفر ابن الوردی (متوفی ۷۷۹ھ) اور شیخ محمد بن عبدالرحیم معروف بہ بقراط اور شیخ ابوعبدالرب محمد بن عبدالدائم البرماوی (متوفی ۸۳۱ھ)[۳۴] جیسے علماء نے اس کی تلخیص کی ہے اس کا مخطوطہ دائرالکتب الظاہریہ میں موجود ہے (نمبر ۶۳۸۶) یہ ابن ہشام النحوی کی شرح اور ڈاکٹر ہادی نہر کی تحقیق کے ساتھ ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء میں شائع ہو چکی ہے۔[۳۵]

۳۔ غایۃ الاحسان فی علم اللسان[۳۶] یہ کتاب بھی علم نحو پر مشتمل ہے اور مخطوطہ کی شکل میں دارالکتب المصریہ (نمبر ۲۴) میں موجود ہے بعض اکابر علماء نے اس کی مبسوط شرح لکھی ہے۔[۳۷]

۴۔ ارتشاف الضرب فی لسان العرب[۳۸]۔ یہ عربی قواعد کے بارے میں دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ ابو حیان کی کتاب شرح التسہیل بہت جامع اور مفصل ہے لہٰذا اس کتاب میں انھوں نے استدلال اور تعلیل سے صرف نظر کر کے محض احکام بیان کیے ہیں تاکہ ایک ہی نظر میں مبتغی مطلوب حاصل ہو جائے اور غیر ضروری غور و فکر کی ضرورت نہ پڑے۔ مصنف نے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلا حصہ ترکیب سے پہلے کلموں کے احکام پر اور دوسرا حصہ ترکیب کی حالت میں کلموں کے احکام پر ہے۔ علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ ان دونوں کتابوں کا شمار علم نحو کی گراں قدر کتابوں میں ہوتا ہے۔ عربی زبان میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ خود علامہ سیوطی نے اپنی کتاب "جمع الجوامع"[۳۹] میں ان سے استفادہ کیا ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر مصطفی احمد النحاس کی تحقیق کے ساتھ ۱۴۰۴ھ میں شائع ہوئی ہے۔[۴۰]

۵۔ النکت الحسان فی شرح غایۃ الاحسان[۴۱] یہ کتاب صرف و نحو سے متعلق ابتدائی درجہ کے طالب علموں کے لیے اہل بصرہ کے اصول و قواعد کے مطابق ترتیب دی گئی ہے۔[۴۲] علامہ عبدالحسین الفتلی نے اس کتاب کو ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء میں شائع کیا۔ اڈنبرا یونیورسٹی برطانیہ میں حسین عبداللہ الذواد نے اس پر تحقیقی مقالہ

لکھا جس پر انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی موسسۃ الرسالہ بیروت سے یہ کتاب ۱۴۰۵ھ میں شائع ہوئی ہے [۴۲]

۶۔ کتاب التذکرہ [۴۳]۔ یہ کتاب نحویوں کی سوانح حیات پر چار جلدوں پر مشتمل ہے اس کی تحقیق ڈاکٹر عفیف الرحمٰن نے ۱۴۰۶ھ میں کی ہے [۴۴]

## علامہ ابوحیان کا سراپا

علامہ ابوحیان بزرگ، لمبے، خوش آواز، خوبصورت، سرخی مائل خوش رنگ تھے، داڑھی بڑی اور بال لمبے تھے۔ یہ ان کا ظاہری حلیہ تھا باطنی طور پر وہ متقی، پرہیزگار اور اللہ سے انتہائی ڈرنے والے جب بھی قرآن سنتے رونے لگتے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ یہی حال غزلیہ اشعار سننے کے وقت بھی ہوتا تھا۔ اشعار رزم کے ہوں یا بزم کے آپ انھیں سن کر اکثر متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے تھے [۴۵] مگر جو دو سخا پر مشتمل اشعار سن کر آپ کے اندر وہ تاثر پیدا نہیں ہوتا تھا جو غزل اور دیگر اشعار سن کر ہوتا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ آپ کی طبیعت میں کسی قدر بخل پایا جاتا تھا۔ تذکرہ نگاروں نے بیان کیا ہے کہ وہ کتابیں خریدنے کے بجائے عاریتاً لے کر پڑھنے کو ترجیح دیتے تھے [۴۶] ان کے بعض اشعار سے بھی ان کی اس کمزوری کا پتا چلتا ہے [۴۷]

## علماء کی مدح و تحسین

علامہ ابوحیان نابغۂ روزگار تھے۔ مختلف علوم و فنون میں آپ کی علمی خدمات سے کوئی بھی انصاف پسند شخص انکار نہیں کر سکتا یہی وجہ ہے کہ پورے عالم میں علماء نے آپ کی علمی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

شوکانی فرماتے ہیں "ابوحیان تفسیر اور عربی زبان کے امام کبیر تھے" [۴۸]

الادفوی فرماتے ہیں "ابوحیان قابل اعتبار، صاف گو اور سراپا حجت تھے" [۴۹]

الکمال جعفر فرماتے ہیں "ابوحیان اپنے زمانے کے ایسے عالم اور ادب عربی کے ایسے مجدد تھے کہ اس میدان میں ان سے کوئی ہم سری اور برابری کا

دعویٰ نہیں کرسکتا۔[۵۰]

ذہبی فرماتے ہیں" ابوحیان مختلف علوم وفنون کے ماہر، عربی ادب میں حجت اور مصر کے احوال کے واقف کار تھے اور اس بارے میں ان کی بہترین علمی خدمات ہیں۔[۵۱]

الداؤدی فرماتے ہیں۔"ابوحیان عربی لغت اور نحو صرف میں درجۂ اعتماد پر فائز تھے۔[۵۲]

الاسنوی فرماتے ہیں" ابوحیان اپنے زمانے میں نحو، لغت، قرأت، حدیث اور شعر ادب کے امام تھے ساتھ ہی آپ خوش الحان تھے، حافظہ قوی اور ذہن تیز تھا۔[۵۳]

الادنسوی فرماتے ہیں" ابوحیان مختلف علوم وفنون کے امام تھے ان سے کافی فائدہ اٹھایا گیا۔ ان کے دور میں ان کی سبقت اور امامت پر لوگوں کا اتفاق تھا اور انھوں نے بہت مقبول کتابیں تصنیف کیں۔[۵۴]

ابن العماد الحنبلی فرماتے ہیں" ابوحیان اپنے زمانے کے نحوی، لغوی، مفسر محدث، ماہر قرأت، مورخ اور ادیب تھے۔[۵۵]

مناع القطان فرماتے ہیں" ابوحیان ایک طرف لغت کے عظیم امام تھے تو دوسری طرف تفسیر، حدیث، اسماء الرجال، طبقات الرجال اور خصوصاً بلاد مغرب کے رجال سے واقفیت میں آپ ید طولیٰ رکھتے تھے۔

صفدی فرماتے ہیں" میں نے ان کو ہمیشہ علم میں مصروف دیکھا ہے۔ یا تو وہ مطالعہ کرتے، لکھتے یا سماعت کرتے تھے اس کے علاوہ ان کو کسی دوسرے کام میں وقت ضائع کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا۔[۵۶] غرض کہ علامہ ابوحیان ایک جید عالم، عظیم مفسر، نابغۂ روزگار نحوی، تاریخ اور اسماء الرجال کے ماہر، لغت وادب کے شہسوار امام کبیر تھے۔ جن کی شہرت کا چہار دانگ عالم میں ڈنکا بج رہا تھا۔

## مراجع وحواشی

[۱] لسان الدین الخطیب، الاحاطۃ فی اخبار غرناطہ ج ۳ ص ۲۳۴ دارالمعارف، مصر،

جلال الدین سیوطی، بغیۃ الوعاۃ ج ۱ ص ۲۸ المکتبۃ العصریہ، بیروت۔

۲۔ المقری، نفح الطیب ج ۳ ص ۳۱۴ - ۳۱۵ المطبعۃ الازہریۃ مصر ۱۳۰۲ھ

۳۔ شماع ابراہیم عبدالرحمٰن المنصور، ابیات النحو فی تفسیر البحر المحیط ص ۱۷ دار التراث العربی مکۃ المکرمۃ ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۴ء

۴۔ ابوحیان، البحر المحیط ج ۱ ص ۱۱ دار الفکر بیروت ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء

۵۔ ابن العماد الحنبلی، شذرات الذہب ج ۶ ص ۷۵-۷۶

۶۔ مصطفیٰ ابراہیم المشینی، مدرسۃ التفسیر فی الاندلس ص ۱۰۵ - ۱۰۶ موسسۃ الرسالہ بیروت ۱۴۰۶ھ

۷۔ شذرات الذہب ج ۶ ص ۱۴۵

۸۔ بغیۃ الوعاۃ ج ۱ ص ۲۸۰

۹۔ نفس مصدر ج ۲ ص ۲۸۱

۱۰۔ نفس مصدر ص ۲۸۰

۱۱۔ نفح الطیب ج ۸ ص ۲۶۲ عمر رضا کحالہ، معجم المولفین ج ۳ ص ۵۵۵ موسسۃ الرسالہ بیروت ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۳ء

۱۲۔ بغیۃ الوعاۃ ج ۱ ص ۱۹۴

۱۳۔ الشوکانی، البدر الطالع ج ۲ ص ۱۱۵ - دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۹۹۸ء معجم المولفین ج ۳ ص ۵۳-۵۴ خلیل بن ایبک الصفدی، الوافی بالوفیات ج ۴ ص ۱۹۳ دار الاندلس بیروت ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء

۱۴۔ طاشکبریٰ زادہ، مفتاح السعادہ جز ۲ ص ۲۱۹ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء الکتابی، الرسالۃ المستطرفۃ ص ۱۳۷، اصح المطابع دہلی ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء، اسماعیل پاشا بغدادی، ہدیۃ العارفین ج ۲ ص ۱۴۰ دار احیاء التراث العربی

۱۵۔ معجم المولفین ج ۱ ص ۸۸ بغیۃ الدعاۃ ج ۱ ص ۲۹۹

۱۶۔ نفس مصدر ص ۲۹۲

۱۷۔ معجم المولفین ج ۱ ص ۵۱۹

۱۸۔ ہدیۃ العارفین ج ۱ ص ۷۲، انجوانساری، روضۃ الجنات ص ۲۹۵ دار الکتب العلمیہ بیروت

۱۹۔ معجم المولفین جزء ۲ ص ۲۶۱

۲۰؎ جمال الدین الاسنوی، نہایۃ السول، مقدمہ ج ۱ ص ۵ عالم الکتب بیروت
۲۱؎ نفس مصدر ص ۵
۲۲؎ بغیۃ الوعاۃ ج ۱ ص ۲۸۲
۲۳؎ مدرسۃ التفسیر فی الاندلس ص ۱۰۵
۲۴؎ البدر الطالع ج ۲ ص ۱۵۵
۲۵؎ نفس مصدر
۲۶؎ الدکتور حسین الذہبی، التفسیر والمفسرون ج ۱ ص ۳۱۸ دار الکتب الحدیثیہ مصر ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء
۲۷؎ بغیۃ الوعاۃ ج ۲ ص ۸۴-۳۸۳
۲۸؎ ابوحیان، البحر المحیط مقدمہ ص ۵ دار الفکر بیروت ۱۴۱۲ھ، البدر الطالع ج ۲ ص ۱۵۴
مدرسۃ التفسیر فی الاندلس ص ۱۰۴
۲۹؎ ابیات النحو فی تفسیر البحر المحیط ص ۲۱-۲۶
۳۰؎ حاجی خلیفہ کشف الظنون ج ۱ ص ۲۲۳ دار احیاء التراث العربی بیروت
۳۱؎ التفسیر والمفسرون ج ۱ ص ۳۱۸
۳۲؎ کشف الظنون ج ۲ ص ۱۵۶۱
۳۳؎ نفس مصدر
۳۴؎ ابیات النحو فی التفسیر البحر المحیط ص ۲۳
۳۵؎ نفس مصدر ص ۲۲
۳۶؎ کشف الظنون ج ۲ ص ۱۱۸۹
۳۷؎ نفس مصدر ج ۱ ص ۶۱
۳۸؎ نفس مصدر
۳۹؎ ابیات النحو فی تفسیر البحر المحیط ص ۲۵
۴۰؎ نفس مصدر ص ۲۲
۴۱؎ ابوحیان، النکت الحسان فی شرح غایۃ الاحسان تحقیق الدکتور عبد الحسین الفتیلی ص ۹
۴۲؎ ابیات النحو فی تفسیر البحر المحیط ص ۲۲
۴۳؎ نفس مصدر

۴۴۔ نفس مصدر

۴۵۔ ابن حجر العسقلانی ، الدرر الکامنہ ج ۴ ص ۳۰۳

۴۶۔ نفس مصدر

۴۷۔ البدر الطالع ج ۲ ص ۱۵۶

۴۸۔ نفس مصدر

۴۹۔ بغیۃ الوعاۃ ج ۲ ص ۲۸۲

۵۰۔ الدرر الکامنہ ج ۲ ص ۳۰۲

۵۱۔ نفس مصدر

۵۲۔ مدرسۃ التفسیر فی الاندلس ص ۱۰۵

۵۳۔ الدرر الکامنہ ج ۴ ص ۳۰۹ - ۳۱۰

۵۴۔ احمد بن محمد الادنسوی ، طبقات المفسرین ، مکتبۃ العلوم والحکم المدینۃ المنورہ ۱۴۱۶ھ ص ۲۷۹

۵۵۔ شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۴۴

۵۶۔ مناع القطان ، مباحث فی علوم القرآن مکتبۃ المعارف الریاض ۱۴۰۸ھ ص ۳۶۷

۵۷۔ البدر الطالع ج ۲ ص ۱۵۴

ماخذ: سہ ماہی الدراسات الاسلامیہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد پاکستان ج ۳۶ شمارہ ۴ اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۱ء ، جمادی الثانی۔شعبان ۱۴۲۲ھ

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کی ایک اہم کتاب

ایمان وعمل کا قرآنی تصوّر

الطاف احمد اعظمی

○ ایمان وعمل کے مروجہ تصور کی کمزوریوں کی نشان دہی کرتی ہے ۔ ○ قرآن وسنت کے نقطۂ نظر کی مدلّل اور دلنشیں تشریح کرتی ہے ۔ ○ ایمان وعمل کے تقاضے اور دنیا اور آخرت میں کامیابی کی راہ واضح کرتی ہے۔

آفسٹ کی طباعت ۔ خوبصورت سرورق ۔ صفحات ۲۸۰ قیمت ۲۵ روپئے لائبریری ایڈیشن ۳۰ روپئے

ملنے کا پتا: ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی ۔ پان والی کوٹھی ۔ دودھ پور ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

## تعارف وتبصرہ

# مقالات "مولانا عبدالسلام ندویؒ حیات اور علمی فتوحات" سمینار

مرتب : محمد ہارون

پتا: ۸/ پہلی منزل، ہندوستان بلڈنگ، ۲/۱۰ ٹی پی اسٹریٹ، ممبئی ۴۰۰۰۰۴
اشاعت : اکتوبر ۲۰۰۱ء صفحات : ۳۰۲ ، قیمت =/۲۰۰

زیرنظر کتاب مولانا عبدالسلام ندویؒ پر ۱۳-۱۴ اکتوبر ۲۰۰۱ء میں ممبئی میں ہونے والے ایک سمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس سمینار کا انعقاد مولانا مرحوم کے بعض اعزا اور عقیدت مندوں نے کیا تھا۔ مولانا کی شہرت علمی حلقوں میں ایک ممتاز عالم دین، مورخ اور ادیب ونقاد کی حیثیت سے ہے۔ مگر علمی دنیا میں انھیں وہ شہرت نہ مل سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ اس میں جہاں ان کے مزاج اور افتادِ طبع کا دخل ہے وہیں ان کے جانشینوں کا بھی قصور ہے۔ اللہ تعالیٰ منتظمین سمینار کو جزائے خیر دے کہ ان کی کوششوں سے مولانا کی حیات اور خدمات کے مختلف پہلوؤں پر معروف اہلِ قلم کی کاوشیں یکجا ہوگئی ہیں۔

بیشتر مقالات معیاری ہیں اور محنت سے لکھے گئے ہیں۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ نے مولانا کی سوانح حیات کے ساتھ علمی سرگرمیوں اور تصانیف وتراجم کا تعارف کرایا ہے۔ پروفیسر کبیر احمد جائسی نے مولانا کی ان تصانیف کا تعارف کرایا ہے جو مکمل ہوجانے کے باوجود دارالمصنفین کے ذمہ داروں کی بے توجہی کی وجہ سے اب تک شائع نہ ہوسکیں یا ناتمام رہ گئی تھیں۔ ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری ڈائرکٹر خدابخش اورنٹیل پبلک لائبریری پٹنہ نے "آثار عبدالسلام" کے عنوان سے مولانا کی تصانیف، تراجم، مضامین، خطبات اور مکتوبات نیز ان کی شخصیت اور علمی وادبی کارناموں پر تصنیف شدہ کتابوں، مضامین اور رسائل کے خصوصی شماروں کی مبسوط ومشروح فہرست تیار کی ہے۔ دیگر مقالہ نگاروں نے مولانا کی تصانیف کی روشنی میں ان کی مورخانہ حیثیت، ترجمہ نگاری، شاعری، مقالہ نگاری، انشاء پردازی اور تنقید نگاری سے بحث کی ہے۔

اگر مولانا عبدالسلام پر منعقد ہونے والا یہ سمینار اور اس میں پیش کیے جانے والے مقالات کا یہ مجموعہ ذمہ داران دارالمصنفین کی توجہ مولانا کی غیر مطبوعہ کتابوں کو منظر عام پر لانے کی جانب مبذول کرا سکے تو یہ منتظمینِ سمینار کی ایک بڑی کامیابی ہوگی۔

(محمد رضی الاسلام ندوی)